تعلیم و تربیت

اکتوبر 2017

ماسٹر معراج الدین

صفحہ نمبر 4

اساتذہ کا عالمی دن

اے دوستو ملیں تو بس اک پیام کہنا
استاد محترم کو میرا سلام کہنا

PP
PAKISTANI POINT
RABTA APNO SE
پاکستانی پوائنٹ

تعلیم و تربیت

77 واں سال چھٹا شمارہ

رکن آل پاکستان نیوز پیپرز سوسائٹی

بچوں کا محبوب رسالہ

اکتوبر 2017ء

اس شمارے میں

اداریہ	مدیر	1
حمد و نعت	ریاض حسین قمر	2
درس قرآن و حدیث	محمد طیب الیاس	3
ماسٹر سراج الدین	سید نظر زیدی	4
ثانی	علی اکمل تصور	8
سم کا راز	ساجد کمبوہ	11
چندو گونا کا خونی تیندوا	شوکت ہاشمی	15
پیارے اللہ کے پیارے نام	راشد نواب شاہی	17
ویران جزیرے کا راز	احمد عدنان طارق	19
کوپن		23
اوجھل خاکے		24
میری زندگی کے مقاصد	پُرعزم قارئین	25
مختصر مختصر	ننھے منے اقتباسات	26
بچوں کا انسائیکلوپیڈیا	ڈاکٹر طارق ریاض خان	28
ایجادوں کی کہانی (ریل گاڑی)		30
محاورہ کہانی	زبیدہ سلطانہ	32
اور نجات مل گئی	آمنہ بتول	33
کھیل دس منٹ کا		35
کھوج لگائیے	ننھے کھوجی	36
روشنی نظر میں ہے	نیئر شفقت	37
بے عنوان قصہ	محمد فاروق دانش	40
کربلا ہو بھلا	سویرا فلک	44
آئیے مسکرایئے		46
آپ بھی لکھیے	ننھے لکھاری	47
لیاقت علی خاں	غلام حسین میمن	51
بوجھو تو جانیں	دل چسپ پہیلیاں	53
دماغ لڑاؤ	ذہین قارئین	54
ایڈیٹر کی ڈاک	ننھے خطوط	55
ہاتھی سب کا ساتھی	محمد خلیل چوہدری	57
چترال کی پہچان	رانا محمد شاہد	59
وادیٔ نیلم کی	اعجاز سرفراز	61
بلا عنوان	دل چسپ جملے	64

اور بہت سے دل چسپ تراشے اور سلسلے

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

السلام علیکم ورحمۃ اللہ!

ایک پارسا کو سونے کی اینٹ کہیں سے مل گئی۔ دنیا کی اس دولت نے اس کے نور باطن کی دولت چھین لی اور وہ ساری رات یہی سوچتا رہا کہ اب میں سنگ مرمر کی ایک عالی شان حویلی بنواؤں گا، بہت سے نوکر چاکر رکھوں گا، عمدہ عمدہ کھانے کھاؤں گا اور اعلیٰ درجے کی پوشاک سلواؤں گا۔ غرض تمول کے خیال نے اسے دیوانہ بنا دیا۔ نہ کھانا پینا یاد رہا اور نہ ذکر حق۔ صبح کو اسی خیال میں مست جنگل میں نکل گیا۔ وہاں دیکھا کہ ایک شخص ایک قبر پر مٹی گوندھ رہا ہے تاکہ اس سے اینٹیں بنائے۔ یہ نظارہ دیکھ کر پارسا کی آنکھیں کھل گئیں اور اس کو خیال آیا کہ مرنے کے بعد میری قبر کی مٹی سے بھی لوگ اینٹیں بنائیں گے۔ عالی شان مکان، اعلیٰ لباس اور عمدہ کھانے سب یہیں دھرے رہ جائیں گے۔ اس لیے سونے کی اینٹ سے دل لگانا بے کار ہے۔ ہاں دل لگانا ہے تو اپنے خالق سے لگا۔ یہ سوچ کر اس نے سونے کی اینٹ کہیں پھینک دی اور پھر پہلے کی طرح زہد و قناعت کی زندگی بسر کرنے لگا۔

پیارے بچو! اللہ تعالیٰ کو سادگی بہت پسند ہے۔ زہد و قناعت میں آسانیاں ہی آسانیاں ہیں۔ ہمارے پیارے نبیؐ اور ہمارے ولی و بزرگ بھی زہد و تقویٰ کی زندگی بسر کرتے تھے۔ اپنے روز مرہ کے کاموں میں سادگی اختیار کریں۔ اپنے کھانے پینے میں، اپنے لباس، اپنی رہائش کو سادہ رکھیں۔ قناعت اور بچت کرنے والی قومیں ہی ترقی کرتی ہیں اور بحیثیت مسلمان اللہ تعالیٰ کے حضور سرخرو ہونے کا بھی ذریعہ ہے۔

اکتوبر میں ہی اسلامی سال کے پہلے مہینے محرم کا آغاز ہو جائے گا۔ اس مہینے کے تقدس کا خیال رکھیے اور اس کی روح پر عمل پیرا ہونے کی کوشش بھی کریں۔

اس ماہ کا رسالہ پڑھیے، آپ کی تجاویز، تنقید اور آراء کا انتظار رہے گا۔ اللہ تعالیٰ آپ کو، آپ کے اہل خانہ اور پیارے وطن پاکستان کو اپنی حفظ و امان میں رکھے۔ آمین!

ایڈیٹر، پبلشر: ظہیر سلام

اسسٹنٹ ایڈیٹر: عابدہ اصغر

سرکولیشن اسسٹنٹ: محمد بشیر راہی

سالانہ خریدار بننے کے لیے سال بھر کے شماروں کی قیمت پیشگی بنک ڈرافٹ یا منی آرڈر کی صورت میں سرکولیشن منیجر، ماہنامہ "تعلیم و تربیت" 32۔ ایمپریس روڈ، لاہور کے پتے پر ارسال فرمائیں۔
فون: 36361309-36361310 فیکس: 36278816

پرنٹر: ظہیر سلام
مطبوعہ: فیروز سنز (پرائیویٹ) لمیٹڈ، لاہور۔
ہیڈ آفس و شوروم: 81۔ ڈی/1، مین بلیوارڈ، گلبرگ، لاہور۔

خط و کتابت کا پتا
ماہنامہ تعلیم و تربیت 32۔ ایمپریس روڈ، لاہور۔
UAN: 042-111 62 62 62 Fax: 042-36278816
E-mail:tot.tarbiatfs@gmail.com
tot tarbiatfs@live com

پاکستان میں (بذریعہ رجسٹرڈ ڈاک) = 1000 روپے۔
مشرق وسطیٰ (ہوائی ڈاک سے) = 2400 روپے۔
ایشیا، افریقا، یورپ (ہوائی ڈاک سے) = 2400 روپے۔
امریکا، کینیڈا، آسٹریلیا، مشرق بعید (ہوائی ڈاک سے) = 2800 روپے۔

قیمت فی پرچہ 35 روپے

بنت سمیرا کی نئی پیش کش

کشمیر مدد سیریز

فیروز سنز کی یوتھ کلب سیریز کے ممبران کے

نئے اور دلچسپ کارنامے

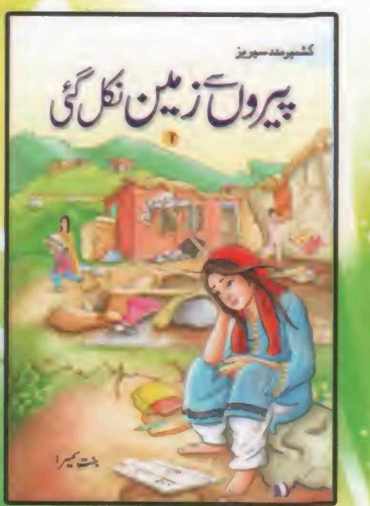

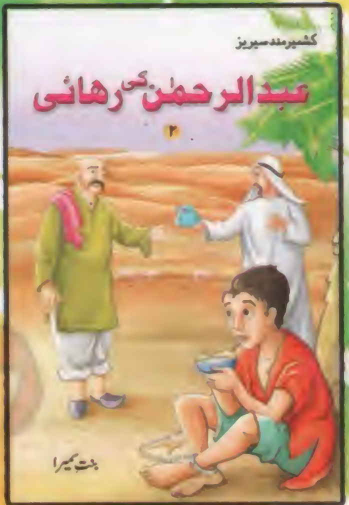

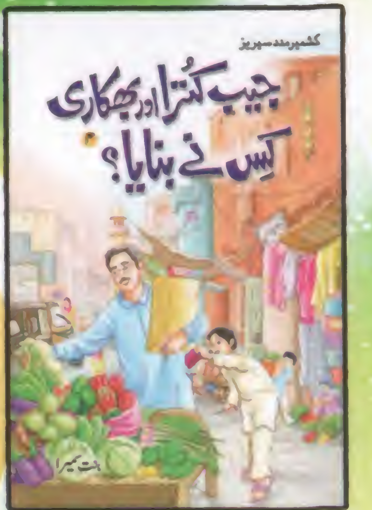

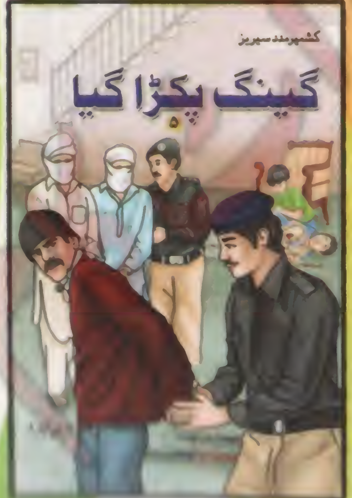

فیروز سنز پرائیویٹ لمیٹڈ

لاہور۔ راولپنڈی۔ کراچی

ہدایات برائے آرڈرز پنجاب: 81۔ ڈی/1، مین بلیوارڈ، گلبرگ، لاہور۔ 042-111-626262

سندھ اور بلوچستان: پہلی منزل، مہران ہائیٹس، مین کلفٹن روڈ، کراچی۔ 021-[illegible]

خیبر پختونخواہ، اسلام آباد، آزاد کشمیر اور قبائلی علاقے: 277، [illegible] 051-[illegible]

حمد باری تعالیٰ

صبح دم یہ افقِ مشرق سے ابھرتا آفتاب
رات کی تاریکیوں میں ہے چمکتا ماہتاب
یاد تیری سے ملی ہے دولتِ امن و سکون
ذکر تیرا ہی مٹاتا ہے دلوں کا اضطراب
تو جسے چاہے کرے محتاج پائی پائی کو
تو جسے چاہے عطا کرتا ہے دولت بے حساب
نہ کوئی معبود ہے نہ خالق و مالک کوئی
جس نے یہ مانا ہوا ہے زندگی میں کام یاب
تو نے محبوبِ مکرم کر دیا ہم کو عطا
ہے اتاری ہم پہ اپنے فضل سے اُم الکتاب
تیری ہستی لم یزل ہے تو فنا سے پاک ہے
تیری قدرتِ کاملہ ہے بے مثال و لاجواب
جنت الفردوس میں اس کا ٹھکانا ہے قمرؔ
تیری نافرمانیوں سے جو کرے گا اجتناب

نعت رسولِ مقبول ﷺ

ذکر انؐ کا لب پہ ہو تو دل میں کھلتے ہیں گلاب
آپؐ چندے آفتاب و آپؐ چندے ماہتاب
آپؐ کا اخلاق حسنہ آپؐ کا حسنِ سلوک
آپؐ کے اوصاف آقاؐ بے شمار و بے حساب
ایک ہی صف میں کھڑے ہیں آج آقا اور غلام
آپؐ ہی دین متیں سے لائے ایسا انقلاب
کوئی عثمانؓ کوئی ہے صدیقؓ تو کوئی علیؓ
کوئی ہے فاروق اعظمؓ یعنی عمر ابن خطاب
یہ جو چاروں شخصیت ہیں آپؐ کے یارانِ خاص
ان کی پوری زندگی ہے بے مثال و لاجواب
پا گیا ہے وہ یقیناً دولت دنیا و دیں
آپؐ کے دربار میں جو ہو گیا ہے بازیاب
آپؐ کی نظرِ کرم ہم پر ہو سرکارؐ جہاں
ہم سے ٹل جائیں خدائے پاک کے سارے عذاب

ریاض حسین قمر

حسد

محمد طیب الیاس

پیارے بچو! جب اللہ تعالیٰ کسی کو علم یا مال کی دولت عطا فرماتے ہیں، یا حسن و جمال سے نوازتے ہیں تو بہت سے دیکھنے والے اُس سے جلنے لگتے ہیں اور چاہتے ہیں کہ یہ نعمت اور خوبی اُس کے پاس نہ رہے۔ اس کو ''حسد'' کہا جاتا ہے۔

پھر حسد کرنے کی تین صورتیں ہیں:

(1) یہ نعمت اور خوبی دوسرے شخص کے پاس نہ رہے۔

(2) یہ نعمت اور خوبی دوسرے شخص کے پاس نہ رہے، میرے پاس آ جائے۔

(3) یہ نعمت اور خوبی دوسرے شخص کے پاس نہ رہے، خواہ میرے پاس آئے یا نہ آئے۔ نیز یہ کہ حاسد (حسد کرنے والا) صاحب نعمت کو تکلیف پہنچانے کے درپے ہوتا ہے، اس کو پریشانی میں مبتلا کر دیتا ہے، لوگوں کو اس کی مخالفت پر اُبھارتا ہے، غرض یہ کہ جلن اُسے کسی صورت چین نہیں لینے دیتی۔

حسد کی یہ تینوں صورتیں ناجائز اور بُری ہیں، اور ان میں سے تیسری قسم نہایت بُری ہے۔

قرآن و حدیث میں حسد کی برائی اور قباحت کو بیان کیا گیا ہے۔

حسد، اللہ تعالیٰ کی تقسیم پر ناخوش اور ناراض ہونا ہے۔ جس کو اللہ تعالیٰ نے جو کچھ دیا ہے اپنی حکمت کے مطابق دیا ہے۔ اب حسد کرنے والا چاہتا ہے کہ یہ نعمت فلاں شخص کے پاس نہ رہے تو حقیقت میں یہ اللہ تعالیٰ پر اعتراض کرنا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اس کو کیوں نوازا اور مجھے اس حال میں کیوں رکھا۔ ظاہر ہے کہ مخلوق کو خالق کے کام میں دخل دینے کا حق نہیں ہے۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے کہ ''یا یہ لوگ اس بنا پر حسد کرتے ہیں کہ اللہ نے ان کو اپنا فضل (کیوں) عطا فرمایا ہے۔'' (النساء:54)

حسد، ایسی برائی ہے کہ قرآن کریم میں اللہ تعالیٰ نے خود حاسدین کے شر سے بچنے کی دعا سکھائی ہے۔

وَمِنْ شَرِّ حَاسِدٍ اِذَا حَسَدَ ''(میں پناہ مانگتا ہوں) حسد کرنے والے کے شر سے جب وہ حسد کرے۔'' (الفلق:5)

جب اللہ تعالیٰ نے حضرت آدم علیہ السلام کو اپنا خلیفہ مقرر فرمایا، تو فرشتوں کو حکم دیا کہ آدم علیہ السلام کو سجدہ کریں، سب فرشتوں نے ان کو سجدہ کیا لیکن ابلیس نے حسد کا شکار ہو کر سجدہ سے انکار کر دیا، لہٰذا اس کی ساری عبادت اکارت گئی اور وہ مردود ہوا۔

؎ گیا شیطان مارا ایک سجدہ کے نہ کرنے سے
اگر لاکھوں برس سجدہ میں سر مارا تو کیا مارا

حسد، ہی وہ گناہ ہے جس کی وجہ سے زمین پر پہلا قتل ہوا، جب حضرت آدم علیہ السلام کے ایک بیٹے قابیل نے دوسرے بیٹے ہابیل کو قتل کیا۔

وہ حسد ہی تھا جس کی وجہ سے برادرانِ یوسف نے حضرت یوسف علیہ السلام کو کنویں میں پھینک دیا۔

ایک حدیث میں ہے کہ نبی پاک ﷺ نے ارشاد فرمایا: ''حسد سے بچو کیوں کہ وہ نیکیوں کو اس طرح کھا جاتا ہے جیسے آگ لکڑیوں کو کھا جاتی ہے۔'' (ابوداؤد، کتاب الادب:4903)

مطلب یہ ہے کہ جب کوئی حسد کا شکار ہوتا ہے تو جس سے وہ حسد کرتا ہے اس کو جانی و مالی نقصان پہنچانے کے درپے ہو جاتا ہے، اس لیے وہ بڑے بڑے گناہوں میں گھر جاتا ہے، اول تو اسے نیکی کرنے کا موقع ہی نہیں ملتا، اور اگر وہ کوئی نیکی کر بھی لیتا ہے تو وہ نیکی آخرت میں اسے ملے گی جس سے اس نے حسد کیا ہے، وہ خود محروم رہے گا، لہٰذا اس کے حسد نے اس کی نیکیوں کو کھا لیا۔

پیارے بچو! ہمارے پیارے نبی ﷺ کا ارشاد ہے کہ ''آپس میں حسد نہ کرو۔'' اس لیے ہمیں کسی کی نعمت اور خوبی کو دیکھ کر جلنا نہیں چاہیے، کیوں کہ آپ نے سنا ہوگا کہ ''جلنے والے کا منہ کالا۔''

☆☆☆

گرمیوں کی لمبی چھٹیوں کے بعد اسکول میں حاضری کا آج پہلا دن تھا۔ اردو کے ماسٹر معراج الدین شاہ سر جھکائے بہت غور اور توجہ سے بچوں کی کاپیاں دیکھ رہے تھے اور بچے خاموش بیٹھے ان کی طرف یوں دیکھ رہے تھے جیسے اپنے بارے میں ان کا فیصلہ سننے کے لیے بے چین ہوں۔

بچوں کی یہ بے چینی ایک تو اس وجہ سے تھی کہ وہ لمبی چھٹیاں گزارنے کے بعد آج پہلے دن اسکول آئے تھے اور اسکول آنا انہیں نئی سی بات لگ رہی تھی۔ پڑھنے لکھنے کے شوقین بچے بھی چاہتے تھے کہ ماسٹر صاحب کاپیاں دیکھ چکیں تو ان کی جان چھوٹے اور وہ اپنے اپنے گھر جائیں۔ پورے اسکول میں بس یہ ماسٹر معراج ہی ایسے استاد تھے جو چھٹیاں ختم ہونے کا مطلب چھٹیاں ختم ہونا سمجھتے تھے اور پہلے دن ہی باقاعدہ کام شروع کر دیتے تھے۔ ورنہ دوسرے مضمون پڑھانے والے استاد تو کئی کئی دن بعد ڈھنگ سے کلاسیں لیتے تھے۔ بلکہ کئی تو ایسے تھے جو چھٹیوں کا کام دیکھتے ہی نہ تھے۔

اس کے علاوہ بچوں کے دلوں میں کھد بد ہونے کی دوسری وجہ یہ تھی کہ ماسٹر معراج رعایت کرنے کے بالکل قائل نہ تھے۔ وہ ہوشیار اور محنتی بچوں کی دل کھول کر تعریف کرتے اور کام چور نالائقوں کو مرغا بھی بنا دیتے۔ آج بچوں میں سے یہ بات کسی کو بھی معلوم نہ تھی کہ کسے شاباش ملے گی اور کون ڈانٹ ڈپٹ کا حق دار ٹھہرے گا۔

کاپیاں دیکھتے دیکھتے ماسٹر معراج نے سر اٹھایا اور ایک بچے کی طرف دیکھ کر کہا۔ ”سراج، ہمارے پاس آؤ!“

ماسٹر صاحب کی یہ بات سن کر بچوں میں کھلبلی سی مچ گئی۔ سب سراج کی طرف دیکھنے لگے۔ سراج کے داہنی طرف کے ڈسک پر بیٹھنے والے خالد نے اپنے ساتھی ندیم سے کہا۔ ”لو بھئی، یہ بے چارہ تو مارا گیا۔ پہلے ہی غریب کی ایک ٹانگ چھوٹی ہے۔ اب دوسری بھی دو چار انچ کم ہو جائے گی۔“

سراج نے ان دونوں کی طرف غصے بھری نظروں سے دیکھا اور اپنی جگہ سے اٹھ کر ماسٹر صاحب کی طرف بڑھ گیا۔ وہ ان دونوں کو اچھا نہیں سمجھتا تھا کیوں کہ وہ اس کے نام کے ساتھ لنگڑا ضرور لگاتے تھے اور ان کی اس حرکت سے اسے بہت رنج ہوتا تھا۔ اس کا دل چاہتا تھا کہ دونوں کو زمین پر گرا کر پہلے گھونسوں سے خوب مرمت کرے اور پھر ان کی ایک ایک ٹانگ توڑ دے تاکہ دوسرے بچے انہیں بھی لنگڑا کہیں۔ لیکن بے چارہ اتنا کمزور اور غریب تھا کہ زبان سے بھی کچھ نہ کہہ سکتا تھا۔ بس دل ہی دل میں کڑھتا رہتا تھا۔

وہ آہستہ آہستہ چلتا ہوا ماسٹر صاحب کی میز کے قریب پہنچ گیا۔ ماسٹر صاحب اس کی طرف ایسی نظروں سے دیکھ رہے تھے

جیسے اس پر غصہ بھی آ رہا ہو اور رحم بھی۔ سراج ان کے قریب پہنچا تو انہوں نے دونوں ہاتھ چھوٹی چھوٹی ڈاڑھی پر رکھتے ہوئے اس کی طرف غور سے دیکھا۔ یہ ان کی خاص عادت تھی اور جب وہ یوں کسی کی طرف دیکھتے تھے تو اس کا مطلب ہوتا تھا کہ اب اسے ہوشیار ہو جانا چاہیے۔

سراج کو اس اسکول میں صرف چھ مہینے ہوئے تھے لیکن ماسٹر صاحب کی اس عادت سے وہ بھی واقف ہو گیا تھا۔ اس لیے وہ کچھ اور پریشان ہو گیا۔ لیکن سب کے اندازے کے خلاف ماسٹر صاحب نے بڑی دھیمی آواز میں سوال کیا۔ ”سراج، تم جانتے ہو سراج کے کیا معنی ہیں؟“

”جی، مجھے معلوم نہیں۔“ سراج نے ڈرتے ڈرتے جواب دیا۔

”کمال ہے! بھئی، سراج تمہارا نام ہے اور تمہیں اس کے معنی معلوم نہیں۔ چلو، خیر، ہم بتاتے ہیں۔ یہ عربی زبان کا لفظ ہے اور اس کے معنی ہیں چراغ۔ چراغ کے بارے میں تو تم جانتے ہو گے یا اس کا مطلب بھی معلوم نہیں؟“

”جی، اس کا مطلب تو معلوم ہے۔ چراغ مٹی کی اس چھوٹی سی پیالی کو کہتے ہیں جس میں تیل اور روئی کی بتی ڈال کر روشنی کے لیے جلاتے ہیں۔“ سراج نے رک رک کر جواب دیا۔

”بالکل ٹھیک۔ گویا تم یہ بات جانتے ہو کہ سراج یا چراغ گھروں میں اجالا کرتا ہے۔ مگر میاں، تم کیسے سراج ہو کہ تمہاری اس کاپی پر بھی اجالا نظر نہیں آتا جس پر تم نے چھٹیوں کا کام کیا ہے۔“ ماسٹر معراج کی آواز اب کچھ اونچی ہو گئی تھی۔ ”سراج میاں، تم نے کام تو ضرور کیا ہے، لیکن سب غلط سلط۔ الفاظ کا املا تک ٹھیک نہیں۔ کیا بات ہے؟ پڑھنے لکھنے میں دل نہیں لگتا تمہارا؟“

جی...... جی ماسٹر جی......“ سراج

کچھ کہنا چاہتا تھا لیکن اس نے بات ادھوری چھوڑ دی۔ اس کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔ ماسٹر معراج کرسی سے اٹھ کر اس کے پاس آ گئے اور بہت محبت سے اس کی کمر پر ہاتھ رکھتے ہوئے بولے ”لیکن کیوں بیٹے؟ آخر پڑھنے لکھنے میں تمہارا دل کیوں نہیں لگتا؟ کیا تم یہ بات نہیں جانتے کہ علم حاصل کر کے ہی انسان صحیح معنوں میں انسان بنتا ہے؟“

”جی، معلوم تو ہے، لیکن......!“ سراج کا گلا رندھ گیا۔ آنسو اس کے گالوں پر بہہ نکلے۔

ماسٹر معراج اس کی یہ حالت دیکھ کر بے چین سے ہو گئے۔ جھک کر رومال سے اس کے آنسو پونچھتے ہوئے بولے۔ ”اگر کوئی خاص بات ہے تو ہمیں بتاؤ، بیٹے۔ ان شاء اللہ ہم تمہاری مدد کریں گے۔“

ماسٹر صاحب کو یوں مہربان دیکھ کر سراج کچھ اور بے چین ہو گیا۔ ہچکیاں لیتے ہوئے بولا۔ ”جی، ایک بات تو یہ ہے کہ اسکول آنے کو میرا دل نہیں چاہتا۔ سب مجھے لنگڑا لنگڑا کہہ کر چھیڑتے ہیں، خاص طور سے یہ خالد اور ندیم۔“

”یہ تو بہت بری بات ہے۔“ یہ کہہ کر ماسٹر صاحب کھڑے ہو

گئے اور خالد اور ندیم کی طرف غصے بھری نظروں سے دیکھ کر بولے۔ ''ادھر آؤ، تم دونوں!''

خالد اور ندیم اب تک مسکراتی نظروں سے سراج کی طرف دیکھ رہے تھے۔ انہیں پکا یقین تھا کہ سراج کو مرغا بنایا جائے گا۔ لیکن ماسٹر صاحب کا حکم سنا تو اپنی فکر پڑی اور جلدی جلدی چلتے ہوئے ان کی میز کے قریب آ گئے۔

''کیوں بھئی، یہ کیا حرکت ہے؟ تم دونوں سراج کو کیوں چھیڑتے ہو؟'' کیا تم یہ نہیں جانتے کہ ہم سب کو اللہ پاک نے بنایا ہے اور جیسا چاہا بنایا ہے۔ اگر کسی میں کوئی کمی نظر آتی ہے تو اس میں اس کا کوئی قصور نہیں۔ یہ تو اللہ کی مرضی ہے۔''

''جی، جانتے ہیں۔'' خالد اور ندیم ایک ساتھ بولے۔

''تو پھر سراج کو کیوں پریشان کرتے ہو؟ یاد رکھو، یہ سخت گناہ ہے۔ یہ تو نعوذ باللہ، خدا کے کاموں میں عیب نکالنا ہے اور وہ اس گناہ کی یہ سزا بھی دے سکتا ہے کہ خود تمہارے اندر وہ عیب یا اس سے بھی برا عیب پیدا کر دے۔ یہ بات تم نے سنی ہو گی کہ بس یا کار کی ٹکر ہو گئی اور ان میں بیٹھے ہوئے درجنوں آدمی زخمی ہو گئے، کیوں ایسی بات سنی ہے نا؟''

''جی'' خالد نے آہستہ سے جواب دیا، اسے وہ واقعہ یاد آ گیا جس میں چند ہی دن پہلے اس کا خالہ زاد بھائی حمید زخمی ہو گیا تھا۔ وہ موٹر سائیکل پر کالج جا رہا تھا کہ ایک تانگہ اچانک اس کے سامنے آ گیا۔ موٹر سائیکل تانگے سے ٹکرائی اور حمید کی داہنی ٹانگ کی ہڈی ٹوٹ گئی۔ یہ واقعہ یاد آیا تو خالد کو یوں لگا کہ خود اس کی داہنی ٹانگ کو کچھ ہو گیا ہے۔ وہ ڈر گیا اور ماسٹر صاحب کی طرف دیکھتے ہوئے بولا۔ ''ماسٹر صاحب، مجھے بہت افسوس ہے کہ میں نے سراج بھائی کا مذاق اڑایا۔ وعدہ کرتا ہوں کہ آئندہ ایسا نہیں کروں گا۔''

''شاباش! شاباش!'' ماسٹر صاحب نے تعریف بھری نظروں سے خالد کو دیکھا اور اس کے کندھے پر تھپکی دیتے ہوئے بولے۔ ''ہمیں معلوم تھا کہ تم ایک اچھے بیٹے ہو۔ اگر تم نے اپنا یہ وعدہ یاد رکھا تو ہم تمہیں یقین دلاتے ہیں کہ دنیا میں بھی عزت حاصل کرو گے اور عاقبت میں بھی اللہ پاک تمہیں اونچا درجہ دے گا۔

''اور ہاں، ندیم، تم بھی یہ بات یاد رکھنا کہ کسی کا مذاق اڑانا اور کسی کو کم درجے کا سمجھنا سخت گناہ ہے۔''

بات ختم کر کے ماسٹر صاحب سراج کی طرف متوجہ ہوئے اور اس کے کندھے پر ہاتھ رکھ کر کہا۔ ''ہاں تو میاں، اس کے علاوہ اور کون سی بات ہے جس کی وجہ سے تم اسکول آنے سے گھبراتے ہو؟''

''جی وہ...... جی وہ اصل میں یہ ہے کہ میرا حافظہ بہت کمزور ہے، کتنا ہی رٹا لگاؤں، کوئی بات یاد ہی نہیں ہوتی۔''

''اگر یہ بات ہے تو اس کا علاج ہم تمہیں بتا دیں گے۔ بس شرط یہ ہے کہ آج سے ٹھیک سات دن بعد تم ہمیں یہ بات یاد دلاؤ۔ کہو، منظور ہے؟'' ماسٹر صاحب نے مسکراتے ہوئے سوال کیا۔

''جی، منظور ہے۔ میں سات دن بعد آپ کو یاد دلا دوں گا کہ آپ نے حافظہ اچھا کرنے کی ترکیب بتانے کا وعدہ کیا تھا۔'' سراج خوش ہو کر بولا۔

''تو بس ٹھیک ہے۔ تم سب اپنی اپنی جگہ جاؤ۔'' ماسٹر صاحب نے کہا اور کرسی پر بیٹھ کر کاپیاں دیکھنے لگے۔

سراج نے سات دن ایک ایک دن گن کے گزارے۔ ساتویں دن وہ وقت سے کچھ پہلے ہی اسکول پہنچ گیا اور جیسے ہی ماسٹر صاحب کلاس روم میں داخل ہوئے، جلدی جلدی چلتا ہوا ان کے پاس گیا۔ آج ایک خاص بات یہ تھی کہ وہ لنگڑا کر نہیں چل رہا تھا، بلکہ بالکل تندرست بچوں کی طرح قدم اٹھا رہا تھا۔

ماسٹر صاحب نے مسکراتی نظروں سے اس کی طرف دیکھا۔ ''ہاں تو سراج بیٹے، یہ بات تمہیں یاد رہی کہ ہم سات دن کے بعد تمہیں ایسی ترکیب بتائیں گے جس پر عمل کرنے سے تمہارا حافظہ اچھا ہو جائے گا؟''

''جی۔'' سراج نے جواب دیا۔ اس کا چہرہ گلاب کے پھول کی طرح کھلا ہوا تھا۔ وہ بہت خوش تھا کہ اب آسانی سے سبق یاد کر لیا کرے گا۔

''لیکن میاں، اس سے پہلے کہ ہم تمہیں وہ ترکیب بتائیں، تم یہ بتاؤ کہ تمہیں یہ نئے جوتے کس نے دیئے ہیں جنہیں پہن کر تم تندرست بچوں کی طرح چل رہے ہو؟'' ماسٹر صاحب نے سوال کیا۔

''جی، یہ جوتے خالد بھائی کی امی نے بنوا کر دیئے ہیں۔ جس دن آپ نے انہیں سمجھایا تھا، اس سے اگلے دن وہ مجھے اپنے گھر لے گئے اور ان کی امی جان مجھے لنگڑاتے ہوئے دیکھ کر کہنے لگیں کہ بیٹے، اگر تم کہو تو ہم تمہارے لیے ایسے جوتے بنوا دیں جنہیں پہن کر تم تندرست بچوں کی طرح چلا کرو گے۔ میں نے تو بہت منع کیا لیکن انہوں نے بنوا ہی دیئے۔ ان میں سے ایک کا تلا اور ایڑی دوسرے سے اونچی ہے۔ انہیں پہن کر میرے دونوں پیر برابر ہو گئے ہیں اور اب میں بھاگ بھی سکتا ہوں۔ خالد بھائی کی امی جان کے دو سو روپے خرچ ہو گئے ان جوتوں پر۔'' سراج کا چہرہ خوشی سے لال ہو رہا تھا۔

''لیکن تمہیں جو فائدہ ہوا ہے وہ تو روپوں کے مقابلے میں بہت زیادہ ہے۔ اس طرح خالد کی امی جان کو جو ثواب ہوا ہے، وہ بھی ان روپوں سے بہت زیادہ ہے۔ بہرحال، اب تم وہ ترکیب سنو جس پر عمل کرنے سے تمہارا حافظہ اچھا ہو سکتا ہے۔ لیکن پہلے ہمیں یہ بتاؤ کہ جب تمہارا حافظہ کمزور ہے تو تمہیں ہماری یہ بات کس طرح یاد رہی کہ ہم نے سات دن بعد حافظہ اچھا کرنے کی ترکیب بتانے کا وعدہ کیا تھا؟''

''جی وہ تو اس لیے یاد رہی کہ میں نے اسے یاد رکھنے کی پوری پوری کوشش کی تھی۔'' سراج نے یوں جواب دیا جیسے پہلے ہی سے سوچ رکھا تھا۔

ماسٹر صاحب مسکراتے ہوئے بولے ''تو میاں، حافظہ اچھا کرنے کی بس یہی ترکیب ہے کہ اپنا سبق بھی اسی طرح کوشش کر کے یاد کیا کرو۔ بات یہ ہے سراج بیٹے، کہ جن بچوں کو سبق یاد نہیں ہوتا، وہ سبق یاد کرنے کی کوشش ہی نہیں کرتے۔ ان کا حال یہ ہوتا ہے کہ نظریں تو کتاب پر ہوتی ہیں، لیکن خیال کہیں اور ہوتا ہے۔ سچ بتانا، کیا خود تمہارا یہی حال نہیں ہوتا؟''

''یہ تو ہے۔'' سراج کو یاد آیا۔ اس کی حالت واقعی ایسی ہی ہوتی ہے۔ جب بھی کتاب لے کر بیٹھتا ہے، دھیان کسی کھیل کی طرف چلا جاتا ہے یا خیال ہی خیال میں کسی جگہ پہنچ جاتا ہے۔ یہ بات یاد آئی تو ساتھ ہی یقین آ گیا کہ ماسٹر صاحب بالکل ٹھیک کہہ رہے ہیں۔ اگر میں سبق یاد کرنے کے لیے بھی ویسی ہی کوشش کروں جیسی کوشش ماسٹر صاحب کی بات یاد رکھنے کے لیے کی تھی کوئی وجہ نہیں کہ سبق یاد نہ ہو۔ اس یقین سے اسے بہت خوشی ہوئی۔ یوں لگا جیسے سات بادشاہتوں کے خزانے کی کنجی ہاتھ آ گئی ہو۔ خوش ہو کر بولا:

''ماسٹر صاحب، یہ بات تو بالکل ٹھیک ہے۔ جب آپ کو یاد دلانے کی بات یاد رہی تو دوسری باتیں کیوں یاد نہیں ہو سکتیں۔ میں پکا وعدہ کرتا ہوں کہ اب اپنا سبق اسی طرح یاد کیا کروں گا۔''

''اور اگر تم اس ارادے پر قائم رہے تو معلوم ہے کیا ہو گا؟'' ماسٹر صاحب نے سوال کیا۔

''جی، مجھے تو معلوم نہیں کیا ہو گا؟'' سراج نے سادگی سے کہا۔

''پھر بیٹے، ایک دن وہ آئے گا کہ تم علم کی سب سے بڑی ڈگری حاصل کر لو گے اور بہت بڑے افسر بن کر قوم اور وطن کی خدمت کرو گے۔ یہ ہمارا وعدہ ہے۔ لیکن شرط یہ ہے کہ خود تم بھی اپنے وعدے پر قائم رہو۔''

''جی، میں ایسا ہی کروں گا۔'' سراج نے سر اونچا کر کے کہا۔

اس بات کو پندرہ سال ہو چکے تھے اور اب سراج علی ایم اے، پی ایچ ڈی کے بعد ایک بڑے کالج کا پرنسپل تھا۔ اس کے وہ دونوں ساتھی، یعنی خالد اور ندیم، بھی اونچی ڈگریاں حاصل کر چکے تھے۔ خالد ایم بی بی ایس ڈاکٹر تھا اور ندیم ایک بہت قابل انجینئر، اور وہ اب بھی گہرے دوست تھے۔

ماسٹر معراج الدین بوڑھے ہو چکے تھے، لیکن وہ بھی خوش حالی کی زندگی گزار رہے تھے۔ خدا کے فضل سے ان کے تینوں بیٹے حکومت پاکستان کے اونچے عہدوں پر فائز تھے۔ حکومت نے ماسٹر صاحب کو ستارۂ خدمت کا اعزاز دیا تھا۔ وہ کبھی کبھی اپنے ان شاگردوں سے ملنے آتے اور اس زمانے کی باتیں کر کے خوش ہوتے جب کسی بچے پر غصہ آتا تھا تو اسے مرغا بنا دیا کرتے تھے۔

سراج، جو اب ڈاکٹر سراج علی تھا، جب بھی اپنے ان محترم استاد سے ملتا، یہ بات ضرور کہتا کہ اگر آپ میری مدد نہ کرتے اور کامیابی کا گر نہ بتاتے تو میں شاید کسی ہوٹل میں معمولی بیرا ہوتا، کیوں کہ ساتھیوں کے مذاق اڑانے اور سبق یاد نہ ہونے کی وجہ سے میں نے اسکول چھوڑنے کا پکا ارادہ کر لیا تھا۔''

دوسری طرف ماسٹر صاحب جواب میں ہمیشہ یہ کہتے ''بیٹے، اصل کمال تو خود تمہارا ہے کہ تم نے اچھی باتیں سنیں اور ان پر عمل کیا۔ اچھی باتیں چھپی ہوئی نہیں ہیں، کتابیں ان سے بھری پڑی ہیں۔ کمی تو ان پر عمل کرنے والوں کی ہے۔''

کیا آپ بتائیں گے کہ ان دونوں میں سے بالکل ٹھیک بات کس کی ہے؟ ماسٹر صاحب کی یا ڈاکٹر سراج علی کی؟ ☆☆☆

ٹافی

علی اکمل تصور

وہ دونوں چلی جا رہی تھیں۔ آج اسکول سے دیر ہو چکی تھی۔ پرنسپل کا خوف انہیں تیز چلنے پر مجبور کر رہا تھا۔ ایسے میں راحت کے اٹھتے قدم رک گئے۔ اس نے ایک دکان دیکھی تھی۔ راحت اپنا رخ بدل کر اس مکان پر چلی آئی۔ اس نے اپنے پرس میں سے بیس روپے نکالے اور دکان دار سے کہا۔

''بھیا...... دس ٹافیاں دے دینا۔'' اس کی سہیلی اس کے ساتھ ہی تھی۔ وہ غصے سے بولی۔ ''تمہارا دماغ تو ٹھیک ہے راحت...... اسکول سے دیر ہو رہی ہے اور تمہیں ٹافیوں کی پڑی ہے۔'' اس کی بات سن کر راحت مسکرانے لگی۔ مگر اس کی مسکراہٹ کسی نے نہیں دیکھی۔ کیوں کہ وہ اس وقت حجاب میں تھی۔

''عائشہ...... تم نہیں جانتی...... یہ ٹافیاں بہت میٹھی ہوتی ہیں۔''

''تم پاگل ہو۔ چلوں گی۔'' عائشہ طنزیہ لہجے میں بولی۔

''ڈاکٹر کے پاس بعد میں چلیں گے۔ پہلے اسکول چلتے ہیں۔ دیر ہو رہی ہے۔'' راحت ہنس پڑی۔ اس کی بات سن کر عائشہ جل کر رہ گئی۔ وہ جب اسکول پہنچیں تو کلاسیں شروع ہو چکی تھیں۔ پرنسپل صاحبہ نے تیوری چڑھا کر ان کی طرف دیکھا مگر کچھ کہا نہیں۔ اب راحت نرسری کلاس کی طرف چل پڑی اور عائشہ کلاس پنجم میں چلی آئی۔ راحت کی وجہ سے عائشہ کا مزاج خراب ہو رہا تھا۔ اس کا بگڑا مزاج دیکھ کر پنجم کلاس کی بچیاں سہم گئی تھیں۔ دوسری طرف راحت ہنستے مسکراتے نرسری کلاس میں داخل ہوئی۔ اس کے باوجود ننھے بچے ٹیچر کو دیکھ کر سہم گئے۔ ایک گول مٹول بچہ تو میز کے نیچے چھپنے کی کوشش کر رہا تھا۔ اس کا انداز دیکھ کر راحت کھلکھلا کر ہنس پڑی۔

''کیا ہوا منے؟'' راحت نے اسے آواز دی۔

''میں نے توم ورت نہیں کیا۔'' وہ توتلی زبان میں بولا۔

''توم ورت......؟ اچھا...... اچھا...... ہوم ورک...... چلو کوئی بات نہیں ہے۔ میں کروا دیتی ہوں۔'' ہنس ہنس کر راحت کا برا حال ہو چکا تھا۔ پھر وہ چونک پڑی۔ اس نے کسی کے چیخنے کی آواز سنی تھی۔ یہ ایک نوعمر بچہ تھا۔ اس کے رونے کی آواز میں کرب تھا...... درد تھا...... تکلیف تھی۔ راحت تڑپ کر کلاس روم میں سے باہر نکلی۔ اسکول کے احاطے میں ایک معصوم بچہ لوٹ پوٹ ہو رہا تھا۔ اس کا اسکول بیگ اس کی امی کے ہاتھ میں تھا۔ وہ بچے کو سنبھالنے کی کوشش کر رہی تھی۔ مگر وہ بچہ مشتعل ہو چکا تھا۔ وہ روتے ہوئے بس ایک ہی راگ الاپ رہا تھا۔

''میں اسکول نہیں جاؤں گا...... میں اسکول نہیں جاؤں گا۔''

''کیا ہوا منے کو......؟'' راحت لپک کر آئی۔

''آج اسکول میں پہلا دن ہے۔'' اس بچے کی امی ہنس پڑی۔

''او اچھا...... چلو منا...... کلاس روم میں چلتے ہیں۔ وہاں تمہارے لیے بہت سے کھلونے موجود ہیں۔'' راحت نے اس بچے کو پچکارا۔

''مجھے کوئی کھلونا نہیں چاہیے...... مجھے بس گھر جانا ہے۔'' وہ روتے روتے بولا۔

''اچھا...... ٹھیک ہے...... چلے جانا مگر پہلے یہ ٹافی تو کھا لو...... بہت میٹھی ہے۔'' راحت پیار سے بولی۔ اس نے اپنے پرس میں سے ایک ٹافی نکال کر اس بچے کی طرف بڑھا دی۔ ٹافی دیکھ کر بچے نے رونا بند کر دیا تھا۔

''چلو اب میں تمہیں کھلونے دکھاتی ہوں۔'' ٹافی اور ٹافی سے بڑھ کر راحت کی میٹھی باتوں نے اس بچے پر اثر کیا تھا۔ وہ راحت کے ہمراہ کلاس روم میں چلا آیا۔ وہاں اپنے جیسے بچوں کو دیکھ کر اس کے خوف میں کمی آئی تھی۔ پھر وہ کھلونوں کے ساتھ بہل گیا۔ یہ کھلونے تعلیمی کھلونے تھے۔ اب راحت نے اس کی ماں کو جانے کا اشارہ کیا۔ راحت کے مثبت رویے سے اس بچے کی امی بھی مطمئن ہو چکی تھی۔ وہ پرسکون واپس لوٹ گئی۔ ابھی تھوڑی دیر گزری تھی کہ راحت کو پرنسپل کا بلاوا آ گیا۔ راحت پرنسپل صاحبہ کے دفتر پہنچی تو وہاں کا ماحول گرم تھا۔ ایک کونے میں عائشہ سر جھکائے کھڑی تھی۔

''کیا ہوا میم۔'' راحت کو فکر ہونے لگی تھی۔ اب پرنسپل صاحبہ گھمبیر لہجے میں بولی۔ ''اس میں کوئی شک نہیں ہے راحت کہ آپ ایک اچھی ٹیچر ہیں۔ آپ کی خواہش پر ہم نے عائشہ کو اسکول سسٹم کا حصہ بنا لیا مگر بچوں کے ساتھ عائشہ کا رویہ مناسب نہیں ہے۔ اس اسکول کا پہلا اصول یہ ہے۔ مار نہیں...... پیار...... اپنی دوست کو سمجھاؤ۔ ورنہ ہم سوچنے پر مجبور ہو جائیں گے کہ عائشہ کو یہاں سے رخصت کر دیا جائے۔'' راحت نے گہری نظر سے عائشہ کی طرف دیکھا۔ عائشہ اس کی بچپن کی سہیلی تھی۔ انہوں نے ساتھ ساتھ تعلیم حاصل کی تھی۔ راحت جانتی تھی کہ عائشہ غصے کی ذرا تیز ہے اور اس میں صبر بھی کم ہے۔ راحت کی وجہ سے عائشہ کو اس اسکول میں نوکری ملی تھی اور آج دوسری بار راحت سے عائشہ کی شکایت کی گئی تھی۔

''جی میم...... آپ فکر مت کریں۔'' راحت، عائشہ کو اپنے ساتھ لیے دفتر میں سے باہر نکل آئی۔ عائشہ ابھی تک غصے میں تھی۔

''یہ لو ٹافی کھاؤ...... بہت میٹھی ہے۔'' راحت نے اپنے پرس میں سے ایک ٹافی نکال کر عائشہ کی طرف بڑھائی۔

''کیا بکواس ہے۔ میں بچی نہیں ہوں اور میری غلطی بھی نہیں تھی۔ ان بچیوں کی غلطی تھی اور باتیں مجھے سننا پڑیں۔'' عائشہ کی آواز میں غصے کے ساتھ ساتھ درد بھی موجود تھا۔

''اچھا...... اچھا...... یہ ٹافی کھاؤ...... سب ٹھیک ہو جائے گا۔'' راحت نے اصرار کیا۔

''مائی فٹ۔'' عائشہ نے ٹافی دیوار کی طرف اچھال دی۔ اس کی اس حرکت پر راحت کو غصہ تو آیا تھا مگر برداشت اس کی فطرت کا حصہ تھا۔ اس کے بعد ان کے درمیان کوئی بات نہیں ہوئی۔ اسکول سے چھٹی کے بعد وہ دونوں گھر کی طرف چل پڑیں۔ ان کا گھر ایک ہی محلے میں تھا۔ چلتے چلتے راحت نے راستہ بدل لیا۔

''کدھر کا پروگرام ہے۔'' عائشہ نے پوچھا۔

''گھر ہی جانا ہے مگر راستے میں تمہیں کچھ دکھانا ہے۔'' راحت اطمینان سے بولی۔

''ایک تو میں تمہاری سوچ اور حرکات سمجھ نہیں پاتی۔'' عائشہ نے کندھے اچکائے۔

''سب سمجھ جاؤ گی...... تھوڑا صبر کرو۔'' باتوں، باتوں میں وہ گلی سے نکل کر سڑک پر آ گئی تھیں۔ یہ راستہ بھی گھوم کر ان کے گھروں کی طرف ہی جاتا تھا۔ پھر چلتے چلتے راحت رک گئی۔ عائشہ نے دیکھا۔ وہ دونوں ایک زیر تعمیر عمارت کے سامنے کھڑی تھیں۔ عمارت کے سامنے کے رخ بانسوں اور لکڑی کے تختوں کی مدد سے ایک ڈھانچہ کھڑا کیا گیا تھا۔ اس ڈھانچے پر کھڑے چند مزدور کام کر رہے تھے۔

''وہ نوجوان لڑکا دیکھ رہی ہو۔'' راحت نے اپنی انگلی سے دوسری منزل کی طرف اشارہ کیا۔ عائشہ نے دیکھا۔ وہ نوجوان لڑکا سیمنٹ کی مدد سے پلستر لگا رہا تھا۔ سورج سر پر آگ برسا رہا تھا۔ اس لڑکے نے میلے کپڑے پہن رکھے تھے۔ یا پھر مزدوری کرنے کی وجہ سے اس کے کپڑے میلے ہو چکے تھے۔ کام کرنے کے دوران وہ بار بار اپنا پسینہ صاف کر رہا تھا۔

''یہ لڑکا اپنے والدین کا اکلوتا بیٹا ہے۔ اکلوتا ہونے کی وجہ سے اس کے والدین اس کے ساتھ ضرورت سے زیادہ پیار کرتے

تھے۔'' راحت نے دھیمے لہجے میں بات شروع کی۔ ''بچپن میں اس لڑکے کا ہر لاڈ ہر ناز اٹھایا گیا۔ جب اسکول جانے کی عمر ہوئی تو اسے اسکول بھی بھیجا گیا مگر اسکول میں اس کا دل نہیں لگتا تھا۔ دن کا آغاز ہوتا اور پھر رونا شروع ہو جاتا۔ ماں اور باپ کے دلوں پر چھریاں چلتیں۔ وہ ہر طریقے سے اسے بہلانے کی کوشش کرتے۔ مگر ساتھ ہی اسے اسکول ضرور چھوڑ کر آتے کیوں کہ وہ تعلیم کی اہمیت سے آگاہ تھے۔ کلاس روم میں بھی یہ روتا رہتا مگر......''

''مگر کیا......؟'' عائشہ نے جلدی سے پوچھا۔

''مگر کسی ٹیچر نے کبھی اسے میٹھی ٹافی نہیں دی۔'' راحت کی آواز میں درد تھا۔

''ہر گزرتے دن کے ساتھ خوف اور صدمے کی شدت میں اضافہ ہوتا چلا گیا اور پھر یہ بیمار ہو گیا۔ والدین تو پہلے ہی اکتائے ہوئے تھے۔ انہوں نے اس بچے کو اسکول سے اٹھا لیا۔ اگلے دن بچہ صحت یاب ہو چکا تھا۔ اب ایک انجانہ خوف سر پر چڑھ کر بولا۔ بچے کو اسکول کا خوف تھا تو والدین کو بچے کے بیمار ہونے کا خوف تھا۔ اس خوف میں تعلیم ہار گئی اور جہالت جیت گئی اور آج کل کا وہ بچہ اور آج کا نوجوان غیر تعلیم یافتہ ہونے کی وجہ سے اجرت پر مزدوری کرنے پر مجبور ہے اور میں سمجھتی ہوں کہ اس کی وجہ ایک میٹھی ٹافی ہے۔ اگر کسی ٹیچر نے اس بچے کو ایک میٹھی ٹافی دی ہوتی تو آج اس نوجوان کی زندگی مٹھاس سے بھرپور ہوتی۔''

''تم اس نوجوان لڑکے کے متعلق یہ سب باتیں کیسے جانتی ہو؟'' عائشہ نے کچھ سوچتے ہوئے سوال اٹھایا۔ ''میں اس نوجوان لڑکے کے متعلق یہ سب باتیں کیسے جانتی ہوں؟'' راحت کھوئے کھوئے لہجے میں بولی۔ اس کی نظروں کا مرکز وہ لڑکا ہی تھا۔ اچانک اس لڑکے کا توازن خراب ہوا۔ وہ بانس کے ساتھ جھول گیا۔ اس کے قدموں کے نیچے موجود لکڑی کا تختہ ٹوٹ چکا تھا۔ تختے پر رکھی سیمنٹ کی کڑاہی دھڑام سے زمین پر آ گری۔ نظر آنے والا یہ منظر راحت برداشت نہیں کر پائی۔ وہ چیخی۔

''بھیا...... سنبھل کے۔'' ضبط ٹوٹا۔ تو وہ پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔ حیرت اور صدمے سے عائشہ سن ہو کر رہ گئی۔ اس نوجوان لڑکے نے راحت کی چیخ سن لی تھی۔ اس نے بانس کے ساتھ لٹکے لٹکے ہاتھ سے اشارہ کیا۔

''فکر مت کرو...... سب ٹھیک ہے...... گھر جاؤ۔'' اتنی دیر میں اس کے ساتھی مزدوروں نے اسے سہارا دے دیا تھا۔ راحت چل پڑی۔ عائشہ اس کے ہمراہ تھی۔

''بھائی...... وہ بھائی ہے میرا۔'' راحت سسکتے ہوئے بولی۔ راحت کی وضاحت سے پہلے ہی عائشہ یہ بات سمجھ چکی تھی۔ اب وہ اپنے دل میں بھی درد محسوس کر رہی تھی۔ ''ٹافی ہے تمہارے پاس۔'' عائشہ نے پوچھا۔

''ہاں...... مگر کیوں۔'' راحت حیرت سے بولی۔

''مجھے ٹافی دو...... ضرورت ہے۔'' عائشہ کرب سے بولی۔ راحت نے اپنے پرس میں سے ایک ٹافی نکال کر عائشہ کے حوالے کر دی۔ عائشہ نے ٹافی کا ریپر ہٹایا اور پھر ٹافی راحت کی طرف بڑھا دی۔

''یہ لو ٹافی...... کھا لو...... بہت میٹھی ہے۔'' عائشہ سسک کر بولی۔ راحت پھر سے رو پڑی تھی۔

اگلے دن راحت کو پھر اسکول سے دیر ہو چکی تھی۔ راہ چلتے وہ ادھر ادھر دیکھ رہی تھی۔ شاید راستے میں عائشہ سے اس کی ملاقات ہو جائے۔ پھر اس نے عائشہ کو دیکھ لیا۔ وہ دکان پر کھڑی ٹافیاں خرید رہی تھی۔

☆☆☆

انمول باتیں

☆ علم انسان کو جہالت سے نکالتا ہے۔

☆ اصل چیز انسانیت ہے، انسانیت کا احترام لازمی ہے۔

☆ جلد بازی انسان کو نقصان دیتی ہے۔

☆ بداخلاقی انسان کو برباد کرتی ہے۔

☆ غریب کی مدد کر کے یہ مت سوچیں کہ میں اس کی دنیا بنا رہا ہوں، بلکہ یہ سوچیں کہ وہ آپ کی آخرت بنا رہا ہے۔

☆ چھوٹی چیزوں کو نظر انداز نہ کریں کیوں کہ ایک چھوٹی سی نیکی بھی انسان کی آخرت بنا دیتی ہے۔

☆ اپنے قیمتی وقت کی قدر کریں کیوں کہ جو وقت گزر گیا وہ کبھی واپس نہیں لوٹتا۔

(حبیب الرحمٰن ملک، کراچی)

سم کا راز

پہلا حصہ

ساجد کمبوہ

تارا گڑھ قصور کا ایک سرحدی قصبہ تھا وہ انڈیا کے بارڈر کے بالکل قریب تھا، اس کے کھیت بالکل باڑھ کے ساتھ تھے صبح کا سہانا تھا، وقت لوگ نماز کے لیے گھروں سے نکل رہے تھے، وہ قصبہ کی واحد مسجد کی طرف رواں دواں تھے کہ فوج کی کچھ گاڑیاں قصبے کی مین سڑک سے آ رہی تھیں۔ فوج رینجر اور پولیس کا دن رات آنا معمول کی بات تھی کیوں کہ اس قصبے کے کچھ لوگ اسمگلنگ وغیرہ میں ملوث تھے، کسی مخبری کی بنا پر اکثر ریڈ کرتی رہتی تھی۔ وہ سڑک اور گلیوں کے ایک طرف ہوتے مسجد میں چلے گئے مگر جب نماز پڑھ کر نکلے تو انہوں نے دیکھا کہ وہ مقامی سیاسی چیئرمین کی حویلی کو گھیرے ہوئے تھے۔ اس کے مین گیٹ پر درجن بھر گاڑیاں کھڑی تھیں اور فوجی جوان رائفلیں تانے چوکس کھڑے تھے۔ چند بوڑھے کھڑے ہوئے مگر جب فوجی جوان نے کہا۔ ''بابا جی! آپ وقت ضائع نہ کریں جا کر اپنا کام کریں لہٰذا وہ ادھر ادھر ہو گئے۔ سب کو تجسس تھا کہ چوہدری سکندر نے کیا کام کیا جو پولیس نہیں فوج آئی ہے؟ مگر کسی نے پاس اس سوال کا جواب نہیں تھا۔ کچھ دور چوپال میں چند افراد بمع مولوی صاحب کھڑے باتیں کر رہے تھے کہ چوہدری سکندر حکومت مخالف تو تھا مگر کسی غیر قانونی کاروبار، دھندے میں ملوث نہ تھا۔ وہ آزادانہ جیتا تھا۔ سارا گاؤں اسے پسند کرتا تھا وہ غریبوں کے دکھ سکھ میں شریک ہوتا تھا۔ اتنا بڑا زمیندار تو نہ تھا مگر دل کا اچھا تھا۔ غریبوں کا خیال رکھتا تھا۔ یہی وجہ تھی کہ لوگ اسے پسند کرتے۔ تین پارٹیوں کے باوجود اس کا آزاد منتخب ہو جانا بڑی بات تھی۔

کچھ دیر بعد دور سے لوگوں نے دیکھا کہ سکندر اور اس کے بیٹے حیدر کو فوج نے ہتھکڑیاں پہنائی تھیں۔ گھر کے ساتھ والی حویلی سے ایک لکڑی کا لمبا سا بکس بھی گاڑی میں رکھا وہ جیسے آئے تھے ویسے ہی روانہ ہو گئے۔ لوگ دیکھتے رہ گئے۔

فوج یا پولیس کا آنا جانا نئی بات نہیں تھی مگر چوہدری سکندر اور حیدر کی گرفتاری پر چہ میگوئیاں ہو رہی تھیں۔ ان کے جانے کے بعد لوگ ان کے گھر کے گرد جمع ہو گئے۔ کچھ دیر بعد چوہدری سکندر کا بیٹا قادر باہر آیا۔ لوگوں نے اس سے پوچھا کہ فوج ان کو کیوں گرفتار کر کے لے گئی ہے؟ اس پر قادر (جو ڈاکٹر تھا اور لاہور ڈیوٹی کرتا تھا ویک اینڈ پر گھر آیا تھا) نے کہا مجھے زیادہ تو خبر نہیں مگر وہ سب حیدر بھائی سے کسی گلزار نامی دہشت گرد کے بارے میں پوچھ رہے تھے جب کہ حیدر کو اس کا علم نہیں تھا۔ وہ مال روڈ پر دہشت گردی کا سہولت کار کے طور پر پکڑ کر لے گئے ہیں کیوں کہ ہماری حویلی سے جو لکڑی کا بکس ملا ہے اس میں رائفل وغیرہ لائی گئی تھی۔ جب کہ

حیدر کا مؤقف تھا کہ وہ اس کے دوست تھے جو اس کی اخبار میں چھپنے والی کہانی کے مداح تھے اور بس قادر صاحب! آپ کو علم ہے کہ مال روڈ پر کچھ دن پہلے خودکش حملہ ہوا ہے جس میں پولیس کے بہت سے اعلیٰ افسر شہید ہوئے تھے۔ اللہ خیر کرے۔ حیدر صاحب تو ادب کے بندے تھے یہ کیسے سہولت کار بن گئے۔ ان کی سبق آموز تحریریں آئے دن اخباروں میں آتی تھیں۔ بخاری میڈیکل اسٹور پر اکثر لوگ ان کی کہانیاں پڑھتے تھے۔

''مولوی صاحب! آپ ٹھیک کہتے ہیں اسے بچپن سے ہی کہانیاں لکھنے کا شوق تھا ہمیں خوشی تھی کہ وہ غیر نصابی اور غیر قانونی سرگرمیوں کی بجائے ادب کی خدمت کرتا تھا مگر...... ہم دعا کرتے ہیں سکندر صاحب حیدر صاحب خیر سے گھر آ ئیں۔''

آج کسی کو کوئل کی کوکو اور پرندوں کی چہچہاہٹ سنائی نہیں دی اور نہ ہی کوے کی کائیں کائیں بری لگی اور تو اور رحمو کمہار کے گدھے بھی ڈھینچوں ڈھینچوں کرتے پاس سے گزر گئے، نہ صادق کسان کے مویشیوں کے گلے میں بندھی گھنٹیوں کی آوازیں محسوس ہوئیں۔ سب دعا کرتے اپنے گھروں کو چل دیئے۔

''جی سکندر صاحب! تشریف رکھیے۔ آپ قیدی نہیں صرف آپ کے بیٹے سے پوچھ گچھ کرنی ہے۔ ایک دہشت گرد نے مرتے ہوئے حیدر کا نام لیا تھا وہ سب کچھ اگل دیتا، تفتیش جاری تھی۔ اس نے پانی مانگا۔ جب جوان لینے گیا اس نے جلدی سے منہ سے ایک نقلی دانت نکالا جس کے نیچے زہریلا کیپسول تھا اور نگل لیا۔ پانی آنے سے پہلے اس کے منہ سے جھاگ نکل رہی تھی۔ قصور...... تارا گڑھ...... حیدر یہ تین نام ہماری سمجھ میں آئے۔ آج آپ ہمارے سامنے ہیں۔ آپ ہمارے لیے معزز ہیں۔ صرف دہشت گردوں کے بارے میں بتایئے پھر فیصلہ کریں گے آپ کا اور آپ کے بیٹے کا!'' فوجی آفیسر نے شائستہ لہجے میں کہا۔

سر میں ایک سیاسی کارکن ہوں اور تارا گڑھ کا خادم۔ میں ملک دشمنی کا سوچ بھی نہیں سکتا۔ پاکستان ہے تو میں ہوں۔ میرے سارے قصبے سے پوچھ لیں غیر قانونی دھندہ کیا ہے اور نہ کرنے دیتا ہوں۔ میرے بیٹے اعلیٰ تعلیم یافتہ ہیں ایک بیٹا قادر، ڈاکٹر ہے۔ جابر، انجینئر ہے بیٹی، بی ایس سی کر رہی اور یہ حیدر ایف ایس سی کر رہا ہے۔ حیدر کو اخبارات میں بچوں کی کہانیاں وغیرہ لکھنے کا شوق ہے اس کی دوستی ابوبکر سے ہے، اسے جاسوسی کہانیاں پڑھنے اور 007 بننے کا شوق ہے اور بس......''

''ہونہہ......'' فوجی آفیسر نے کہا۔ ''سکندر صاحب اگر آپ نے یا آپ کے بچوں نے ملک عزیز کے خلاف کوئی قدم اٹھایا ہو یا سہولت کار کا کردار ادا کیا ہو تو میں ملک کی خاطر آپ سے کوئی رعایت نہیں کروں گا۔ یہ میرا فرض ہے اور وطن سے محبت...... او کے...... آپ آرام کریں۔ ہم تحقیقات کے لیے آپ کو اور آپ کے بیٹے کو لائے ہیں۔ اب اس سے پوچھ گچھ کرتے ہیں۔'' آفیسر نے اشارہ کیا۔ ایک فوجی جوان سکندر کو لے کر گیا اور سکندر کے بیٹے حیدر کو فوجی آفیسر کے سامنے بٹھا دیا۔

''جی بیٹا! مجھے سچ سچ بتانا ورنہ......؟'' فوجی آفیسر نے حیدر کی آنکھوں میں آنکھیں ڈالتے ہوئے کہا۔

''سر! میں اور نہ میرے گھر والے وطن دشمنی کا سوچ بھی نہیں سکتے۔ میری کہانیاں سبق آموز اور وطن سے محبت کے بارے میں ہیں۔ اگر نادانستگی میں کوئی غلط کام ہوا۔ میں معافی کا طلب گار ہوں...... میری سب سے معتبر گواہی ابوبکر ہے۔ وہ میرے بچپن کا ساتھی ہے۔ میرا ماضی اور حال اس کے سامنے ہے۔''

''ہمیں اس کی گواہی کی ضرورت نہیں۔ تمہاری حویلی سے لکڑی کی پیٹی ملی ہے جو اسلحہ لانے کے لیے استعمال ہوئی ہے۔ تمہارے گاؤں والوں نے بتایا کہ کچھ مشکوک افراد کا آنا جانا تھا، وہ بھی رات کو اور تم ان کے میزبان تھے۔ تم کیا کہتے ہو؟'' فوجی آفیسر کا لہجہ سرد تھا۔

''سر! میں بے قصور ہوں میں نے ایسا کوئی جرم نہیں کیا جس پر آج شرمندگی ہو۔ وہ افراد میری ایک کہانی کے سلسلے میں میرے فین تھے بلکہ دوست بن گئے تھے۔ ان کی سرگرمیوں کا مجھے علم نہ تھا، وہ دو تین بار ملنے آئے تھے۔ میں نے مہمان خانے میں رہنے کی پیشکش کی مگر انہوں نے کھلی جگہ یعنی حویلی میں رہنے کو ترجیح دی۔ وہ اپنی گاڑی پر آئے تھے۔ رات رہے ہم ان کے ساتھ سیر کے لیے گئے تھے۔''

''بیٹا! ایسے بات نہیں بنے گی۔ تم کہانیاں لکھنے والے کو خبر نہ ہوئی کہ تم اتنی بڑی غلطی کر رہے ہو اور خود کہانی بننے جا رہے ہو؟ تم کہانی کے تانے بانے کیسے بنتے ہو جب کہ انہیں دیکھ کر احساس نہ ہوا کہ وہ غلط بندے ہیں ان کی باتوں، موبائل فون، لب و لہجہ سے

خبر نہ ہوئی کہ......؟؟ او کے! تم اور تمہارے والد صاحب ادھر ہی رہیں گے۔ اگر تم ملوث ہوئے تو......؟؟''

''جی۔ ہم تیار ہیں، ہم محبِ وطن ہیں۔ وقت ثابت کرے گا۔ فوجی آفیسر نے ان کے گھر کی تلاشی لی تھی۔ اس وقت کوئی اسلحہ وغیرہ نہیں ملا تھا۔ اس نے قادر کا نمبر لے کر اسے فون کیا کہ فلاں ریک میں حیدر کی ڈائری لے کر فوراً فلاں جگہ پر آ جاؤ۔'' قادر حیدر کی ڈائری لے کر تفتیشی مرکز پہنچ گیا۔ اس نے دیکھا کہ ان کے والد سکندر اور حیدر علیحدہ علیحدہ کمروں میں تھے، ان پر سخت پہرہ تھا۔ ڈاکٹر قادر کو ان سے بات چیت نہ کرنے دی گئی۔

رات کا کھانا کھانے کے بعد فوجی آفیسر نے حیدر کی ڈائری کھولی۔ شروع شروع میں کون سی کہانی کس نیوز پیپر میں شائع ہوئی۔ کس ڈیٹ کو کس میگزین میں اقوال زریں، لطائف یا کہانی آئی...... فوجی آفیسر سرسری دیکھ کر ڈائری کے ورق پلٹتے رہے۔ کچھ اخبارات، میگزینوں کے ایڈریس بھی لکھے تھے۔ دوستوں، میگزین ایڈیٹروں کے فون نمبر، ایڈریس وغیرہ بھی تحریر تھے۔ اس طرح آدھی سے زائد ڈائری پڑھی کچھ بھی نہ تھا...... پھر ایک صفحہ دیکھا اس پر لکھا تھا۔ ''آج میں بہت خوش ہوں آج میری کہانی شیخی کا انجام شائع ہوئی۔ باجی حمیرا اظہر کا شکریہ سب سے پہلی کہانی میری تھی۔ مزے کی بات کہ میرے نام کے ساتھ میرا سیل نمبر بھی تحریر تھا۔ کہانی سبق آموز تھی میری بہت سی کہانیوں میں بیسٹ تھی۔ کہانی کے ساتھ سیل نمبر کا شائع ہونا پھر دھڑا دھڑ دوستوں، قارئین، پسند کرنے والوں کی کالز نے مجھے بہت خوشی دی۔ میسج پہ میسج آ رہے تھے میری کہانی کو بہت پسند کیا گیا تھا۔ ملک کے چاروں صوبوں سے فون کالز آ ئیں۔ تفتان بارڈر جو ایران کے ساتھ ہے وہاں سے بھی پسندیدگی کی کالز آ ئیں۔ مجھے ایسے لگتا تھا کہ میں بہت مشہور رائیٹر ہوں۔ ابوبکر میرے شانہ بشانہ تھا، وہ جاسوسی ناول پڑھنے میں بدنام تھا۔ اس نے بھی میری کہانی کی تعریف کی۔ مجھے بہت اچھا لگا۔ گھر والوں نے مجھ سے مٹھائی بھی کھائی۔ کالج میں لیکچرار صاحب نے بھی اسے بہت سراہا۔ یوں تو اخبارات کے مختلف شہروں میں ایڈیشن چھپتے ہیں اکثر اخباروں کے ''بچوں کا صفحہ'' پورے ملک کے لیے ہوتا ہے۔ بہت سے پڑھنے والوں نے فرینڈ شپ کی آفر کی۔ دس بارہ روز بعد ایک کال آئی۔ ''مسٹر حیدر آف تارا گڑھ قصور......''

''جی...... جی بول رہا ہوں۔''

بھئی لاجواب کہانی لکھی آپ نے...... ویری نائس...... آپ تارا گڑھ کے رہنے والے ہیں؟ وہی جو قصور انڈیا بارڈر پر ہے۔''

''میں نے کہا جی وہی مگر آپ کیسے جانتے ہیں؟''

ہمارا آبائی گھر قصور ہی ہے۔ اب ہم اسلام آباد شفٹ ہو چکے ہیں۔ پاکستان بننے کے بعد کراچی پھر اسلام آباد رہائش پذیر ہیں۔

''شکریہ سر! آپ میرے گاؤں سے ہیں مجھے یہ سن کر بہت خوشی ہوئی۔''

''مسٹر حیدر! آپ ہمارے پاس اسلام آباد آئیں۔ ہم آپ کو سیر کروائیں گے، مہمان نوازی کریں گے، آپ کی خدمت کریں گے۔''

''آپ کی مہربانی سر! دعاؤں میں یاد رکھیں یہی میرے لیے بہت ہے۔''

''ہم آپ کے لیے دعا گو ہیں مسٹر حیدر...... ایک بات کہوں اگر آپ برا نہ مانیں تو......؟''

''کہیں سر! برا ماننے کی کیا بات ہے۔'' میں نے کہا۔

''بات یہ ہے کہ میں اپنا آبائی گاؤں دیکھنا چاہتا ہوں اس سنڈے کو لاہور آ رہا ہوں۔ وہاں سے قصور زیادہ دور تو نہیں۔ کیا آپ دو بندوں کی مہمان نوازی کر سکتے ہیں؟ مل کر لاہور کی سیر بھی کریں گے۔ پیر کو دفتری کام نپٹا کر اسلام آباد واپس آ جاؤں گا۔ کیا خیال ہے؟''

''خیال تو نیک ہے مگر سر! والد صاحب مجھے اکیلا لاہور نہیں آنے دیں گے میرا ایک دوست ابوبکر ہے اسے بھی......''

''نو ٹینشن! کیا قصور آؤں یا لاہور میں ہی ٹائم اور مقام کا انتخاب کر لیں!'' اس نے کہا۔

''آپ ایسا کریں گجومتہ آ جائیں۔ ہم بھی ادھر سے آ جائیں گے۔ وہاں سے میٹرو بس پر سفر کرتے ہوئے مینار پاکستان، بادشاہی مسجد، شاہی قلعہ اور علامہ اقبال کے مزار پر بھی سلام کر لیں گے۔''

''اوکے! آپ گجومتہ صبح نو بجے پہنچ جایئے گا۔ ہم بھی اسلام آباد سے آ جائیں گے۔''

''ان شاء اللہ!'' میں نے وعدہ کر لیا۔

جب ابوبکر سے بات کی اس نے کہا کہ تم نے خواہ مخواہ وعدہ کر لیا۔ نا آشنا لوگوں سے ملنا اچھی بات نہیں کیا خبر......؟

''یار ابوبکر! وہ ہمارے گاؤں کے رہنے والے ہیں۔ سب سے بڑی بات میرے فین ہیں مشکوک لوگ ہوں گے تو واپس آ جائیں گے ویسے بھی میٹرو بس میں سفر کا مزہ ہی الگ ہے وہ بھی سستے میں۔

''اچھا جناب! مگر ہر کسی پر بھروسہ کرنا بے وقوفی ہے۔ آج کل کے حالات کے پیش نظر......'' سنڈے کو تیار رہنا اگر وعدہ نہ کرتا تو شاید نہ جاتے۔ اوکے۔

ہم جوں ہی گجومتہ پہنچے تو نوجوان لڑکے ہماری طرف بڑھے یقیناً آپ حیدر اور ابوبکر ہیں۔ میں گلزار اور یہ میرا دوست چوہدری حمید...... ویلکم آپ تو وقت کے پابند نکلے......''

ہم چاروں بس کی طرف بڑھے۔ گلزار فوراً میرے ساتھ بیٹھ گیا جبکہ ابوبکر کے ساتھ چوہدری حمید۔ میں نے محسوس کیا کہ گلزار میرے ساتھ زیادہ ہی فری ہونا چاہتا ہے۔ ایسے گپ شپ کر رہا تھا جیسے مدت سے جانتا ہو۔ پہلے میری کہانی سے لے کر کہانیوں تک، پھر گردو پیش، سیاست، ضرب عضب اور رد الفساد پر بحث کرنے لگا۔ اس کی باتیں مجھے کچھ مشکوک اور نامناسب محسوس ہوئیں مگر میں نے نظرانداز کر دیا۔ میٹرو بس سے اتر کر ہم پہلے مینار پاکستان اترے۔ وہاں سے بادشاہی مسجد، شاہی قلعہ گئے۔ علامہ اقبال کے مزار پر حاضری کے بعد حمید نے رکشا پکڑا، ہم مال روڈ پر چڑیا گھر پہنچ گئے۔ انہوں نے ٹکٹ لیے میں نے احتجاج کیا کہ ہمیں بھی پارٹنر شپ کرنے دو اس پر گلزار نے فلسفیانہ انداز میں کہا۔ ''دوست ہم نے آپ کو دعوت دی ہے، جب آپ کے ہاں قصور آئیں گے تو آپ مہمان نوازی کر لینا ہم منع نہیں کریں گے۔'' اس دوران متعدد بار گلزار کو موبائل پر فون آئے، وہ ایک طرف ہو کر مختصر بات کرتا۔ اوکے فارغ ہو کر بات کروں گا کہہ کر موبائل آف کر دیتا۔

چڑیا گھر سے جلدی باہر آئے۔ الفلاح بلڈنگ کے پاس برگر اور کولڈ ڈرنک پیا۔ اس کے بعد چیئرنگ کراس کے ایک طرف کھڑے ہو کر گلزار کہنے لگا کہ چوک بہت خوب صورت ہے یہاں پر واپڈا ہاؤس، اسلامک مینار، سامنے پنجاب اسمبلی، ادھر الفلاح بلڈنگ، پیچھے ایوان اقبال، ساتھ ہی آواری ہوٹل اور الحمراء ہالز، کاش ادھر کہیں گھر ہوتا......'' ''آپ اسلام آباد والے حسرت سے بات کر رہے ہیں؟'' ابوبکر نے سوال کیا۔ کچھ دیر بعد ہم ایک ریسٹورنٹ میں گئے۔ حمید نے روسٹ کا آرڈر دیا۔ ایک ٹیبل پر بیٹھ گئے۔ گپ شپ شروع ہو گئی۔

''یار حیدر! یہ چھانگا مانگا اور ہیڈ بلوکی یہاں سے کتنا دور ہے۔ اس کا بہت سنا ہے، بس حسرت ہے کہ وہاں کی سیر کی جائے......''

''ہے تو ضلع قصور میں مگر فاصلہ بہت ہے تقریباً 70 کلومیٹر کا فاصلہ ہوگا۔'' ابوبکر نے کہا۔

''بس...... یہ کون سا فاصلہ ہے میں سمجھا تین چار سو میل ہوگا۔ گلزار نے قہقہہ لگایا۔ کار میں ڈیڑھ گھنٹہ بھی نہیں لگے گا۔ اگر محسوس نہ کرو میں کار ہائیر کر لوں گا......'' گلزار نے کہا۔ (باقی آئندہ)

پچھلے ہفتے کی تیز بارشوں نے انہیں دھو دیا تھا۔ میں محتاط قدموں سے آگے بڑھتا رہا اور پل عبور کر کے اس مقام تک پہنچ گیا جہاں ماجد میاں کے ساتھیوں نے اپنی جیپ روکی تھی۔ پھر میں اس مقام سے بھی آگے بڑھ گیا۔ اس طرف کی ڈھلان ختم ہوتے ہی دونوں طرف اونچے اونچے درختوں کا جنگل پھیلا ہوا تھا۔ میں نے ایک جگہ رک کر چاروں طرف بہ غور دیکھا۔ اچانک مجھے اپنے پیچھے مدھم سی غراہٹ سنائی دی۔ میں نے تیزی سے پلٹ کر دیکھا وہاں کچھ نہیں تھا۔ گھنی جھاڑیاں ہوا سے ہل رہی تھیں اور سوکھے پتے شاخوں سے ٹوٹ ٹوٹ کر نیچے گر رہے تھے۔ چند لمحوں تک میں اس طرف منہ کیے دیکھتا رہا اور پھر آہستہ آہستہ جیپ کے قریب آیا۔

جیپ میں بیٹھ کر میں نے رائفل گود میں رکھ لی۔ انجن اسٹارٹ کیا اور ایکسیلیٹر دبا کر پوری اسپیڈ سے آدھا پل اور ڈھلان عبور کر گیا۔ اب آسمان پر سیاہ بادل گھر آئے تھے اور ہوا میں نمی شامل ہو گئی تھی۔ ایسا محسوس ہوتا تھا کہ بارش ہونے والی ہے۔ میں نے جیپ کو پوری اسپیڈ پر چھوڑ دیا۔ جنگل کی حد ختم ہونے کے بعد سڑک پھر کرناٹلی کے کنارے سے مل گئی اور تھوڑے فاصلے پر مجھے چند لکڑی کے بنے ہوئے بڑے بڑے مکانات نظر آئے۔ قریب جانے پر معلوم ہوا کہ وہ کپتائی کا فاریسٹ ریسٹ ہاؤس ہے جس کے گرد و پیش اسٹاف کوارٹرز بنے ہوئے ہیں۔ ایک نوجوان ریسٹ ہاؤس کے بنگلے کی سیڑھیوں پر بیٹھا ہوا تھا۔ مجھے دیکھ کر کھڑا ہو گیا۔

میں نے جیپ روک لی۔ نوجوان کی مدد سے جیپ کی چھت چڑھائی اور برآمدے میں آرام کرسی پر بیٹھ گیا۔ دریافت کرنے پر معلوم ہوا کہ وہ نوجوان ریسٹ ہاؤس کا چوکی دار ہے جو اپنے بال بچوں کے ساتھ پچھلے کوارٹر میں رہتا ہے۔ میں نے اسے اپنا ٹفن کیریر دیا کہ وہ گھر سے کھانا گرم کروا کر لا دے۔ اس کے جاتے ہی بارش شروع ہو گئی۔

کھانا کھا کر میں کچھ دیر کے لیے کمرے میں جا کر لیٹ گیا۔ ایک گھنٹے کے بعد جب میں بیدار ہوا تو بارش تھم گئی تھی اور مطلع بالکل صاف تھا۔ تھرماس کی آخری ایک کپ چائے پینے کے بعد میں باہر آیا۔ چوکی دار کی مدد سے جیپ کی چھت اتروائی اور پھر جیپ گھما کر واپس چندر گونہ کے راستے پر روانہ ہو گیا۔

فاریسٹ ریسٹ ہاؤس سے لگ بھگ چار میل کے فاصلے پر گھنے جنگل کی حد شروع ہوتی تھی۔ میں نے جنگل کے باہر سڑک پر جیپ روک دی اور رائفل ہاتھوں میں تھام کر پیدل چلنے لگا۔

سورج کی کرنوں سے سارا جنگل جھلملا رہا تھا۔ پتوں پر بارش کی بوندیں موتیوں کی طرح لرز رہی تھیں اور ہوا میں عجیب سی مہک رچی ہوئی تھی۔ میں نے رائفل بغل میں دبا کر اس کی نال بازو کے ساتھ زمین کی طرف جھکا دی اور سیٹی بجاتے ہوئے لاپروائی کے انداز میں سڑک پر چلنے لگا۔ ایک فرلانگ جنگل میں جانے کے بعد مجھے دائیں ہاتھ پر ایک پگڈنڈی نظر آئی میں نے غیرارادی طور پر سڑک چھوڑ دی اور پگڈنڈی پر چل پڑا۔

میرے دونوں طرف گھنی جھاڑیاں تھیں۔ کہیں کہیں پانی سے لبریز گڑھے تھے۔ پگڈنڈی لہراتی ہوئی جنگل میں گزر رہی تھی۔ اچانک میرے بائیں طرف ایک لنگور زور سے چیخا اور پھر درخت سے کود کر پگڈنڈی پھلانگتا ہوا دائیں طرف کے درختوں پر چڑھ گیا۔ میں ابھی اس سمت بہ غور دیکھ ہی رہا تھا کہ میرے سامنے والے درخت پر کوے شور مچانے لگے اور پھر کائیں کائیں کرتے ہوئے دائیں طرف اڑ گئے۔

میں اس وقت تک ایک پختہ کار شکاری نہیں تھا۔ تاہم اس شور وغل سے مجھے خطرے کا احساس ہونے لگا۔ تیندوے کے بارے میں میں نے کتابوں میں پڑھا تھا کہ انتہائی مکار اور خون خوار جانور ہے۔ اپنے شکار کا میلوں تک خاموشی سے تعاقب کرتا ہے پھر موقع پا کر بغیر آواز کے اچانک حملہ کرتا ہے اور اپنے تیز ناخنوں سے سب سے پہلے اس کا پیٹ پھاڑ دیتا ہے۔ میں نے رائفل کو مضبوطی سے ہاتھوں میں تھاما اور دائیں بائیں دیکھتا ہوا تیز تیز قدموں سے آگے بڑھنے لگا۔ درخت کے نیچے پہنچ کر میں نے اچانک راستہ بدلا اور بائیں طرف کے ایک طرف چھوٹے سے ٹیلے پر چڑھ گیا۔ ٹیلے کی گیلی مٹی میں میرے پاؤں دھنسنے لگے لیکن میں زور لگا کر تیز تیز قدم اٹھاتا ہوا اوپر چڑھ گیا۔

چوٹی پر پہنچ کر میں نے اس سمت نظر دوڑائی جہاں سے لنگور چیخ کر بھاگا تھا تو مجھے ایک طرف جھاڑیاں ہلتی ہوئی نظر آئیں اور پھر کسی جانور کے بھاری جسم کے گزرنے کی جھلک دکھائی دی۔ یہ تیندوا تھا۔ میرا خیال بالکل صحیح تھا۔ وہ پگڈنڈی کے ساتھ ساتھ جھاڑیوں کی اوٹ میں میرا تعاقب کر رہا تھا۔

اب صورت حال یہ تھی کہ میں ٹیلے کے اوپر کھڑا ہوا تھا اور مجھ سے آٹھ فٹ نیچے جھاڑیوں میں وہی تیندوا موجود تھا۔ جھاڑیوں میں مجھے اس کی ہر حرکت نظر آ رہی تھی لیکن میں زیادہ دیر تک اس کی طرف نہیں دیکھ سکتا تھا کیوں کہ میں اسے یہ احساس نہیں دلانا چاہتا تھا کہ میں خود اس کا متلاشی ہوں۔ میں نے دل کڑا کر کے تیندوے کی طرف پیٹھ گھما لی اور بھاگتا ہوا ٹیلے سے نیچے اتر گیا۔

نیچے پہنچتے ہی میں نے زور سے ایک چھلانگ لگائی اور ایک چھوٹا سا گڑھا عبور کر کے ایک بڑی جھاڑی کی اوٹ میں چھپ گیا۔ میرے حواس بڑی تیزی سے کام کر رہے تھے۔ وہ خطرناک لمحہ آ پہنچا تھا جس کا مجھے صبح سے انتظار تھا۔ میں نے تیندوے پر یہ ظاہر کرنے کی کوشش کی تھی کہ میں اس سے خائف ہو کر بھاگا ہوں۔ میں نے رائفل گھٹنوں پر رکھ کر جیب سے اپنا شکاری چاقو نکالا اور اسے کھول کر سامنے رکھ لیا۔ پھر میں نے رائفل تھام کر آہستہ آہستہ جھاڑیوں سے اپنا سر اوپر اٹھایا۔

میرے بالکل سامنے۔ زیادہ سے زیادہ دس فٹ کے فاصلے پر تیندوا کھڑا غضب ناک نظروں سے میری طرف دیکھ رہا تھا اس کی آنکھوں سے آنکھیں ملتے ہی میرے تمام جسم میں بجلی سی دوڑ گئی۔ میں نے رائفل کی نال اوپر اٹھائی اور عین اس وقت جب وہ اپنا ڈراؤنا خون خوار منہ کھول کر مجھ پر جست لگانے والا تھا میں نے اس کے ماتھے کا نشانہ لے کر فائر کر دیا۔

تیندوا پلٹ کر گرا۔ ایک خوف ناک گرج کی سی آواز اس کے حلق سے برآمد ہوئی۔ اس نے لمبی گھاس پر دو قلابازیاں کھائیں اور پھر تیزی سے اٹھ کر میری طرف لپکا۔ میں نے اس کے سر کا نشانہ لے کر دوسرا فائر کیا اور تیندوا نڈھال ہو کر زمین پر گر گیا۔

انتہائی جوش اور مسرت کے عالم میں میں اٹھ کر کھڑا ہو گیا اور تیزی سے اس کی طرف بڑھا۔ تیندوا گھاس پر تڑپ رہا تھا ایک بار سر اٹھا کر اس نے خون خوار آنکھوں سے میری طرف دیکھا۔ میں نے رائفل کی نال اس کی طرف اٹھائی اور پے در پے تین اور فائر کر کے اسے ہمیشہ کی نیند سلا دیا۔

پھر میں نے اس کی سرد خون آلود لاش کو دیوانہ وار ٹھوکریں ماریں اور جب تھک گیا تو اس پر بیٹھ کر سگریٹ کے لمبے لمبے کش لگانے لگا۔

☆☆☆

پیارے اللہ کے پیارے نام

پہلا حصہ

راشد علی نواب شاہی

اَلْبَاعِثُ جَلَّ جَلَالُہٗ

(زندہ کر کے قبروں سے اٹھانے والا)

اَلْبَاعِثُ جَلَّ جَلَالُہٗ وہ ہے جو رسولوں کو اپنے احکامات دے کر لوگوں کی طرف بھیجتا ہے اور ''اَلْبَاعِثُ جَلَّ جَلَالُہٗ'' ہی وہ ہے جو تمام انسانوں کو قبروں سے دوبارہ زندہ کر کے اٹھائے گا۔

عزیز ساتھیو! اللہ تعالیٰ کا لاکھ لاکھ شکر ہے کہ ہم مسلمان ہیں اور مسلمان اس بات کو بھی مانتے ہیں کہ جب سب لوگ مر جائیں گے تو اللہ تعالیٰ ان سب کو پھر زندہ فرمائیں گے، تاکہ اچھے لوگوں کو اللہ تعالیٰ جنت میں داخل فرمائیں۔ جنت میں طرح طرح کی نعمتیں ہوں گی اور وہاں کسی قسم کی کوئی تکلیف نہ ہو گی۔ دنیا میں کبھی سر میں درد ہوتا ہے تو کبھی پیٹ میں تکلیف ہوتی ہے، وہاں ایسا کبھی نہ ہو گا۔

اللہ تعالیٰ کو نہ ماننے والوں کو جہنم میں داخل کر دیا جائے گا، جہاں آگ کی سزا ہو گی۔ جہنمی ہمیشہ آگ میں جلتے رہیں گے۔ اللہ تعالیٰ سب مسلمانوں کی حفاظت فرمائے۔ آمین!

۳۰۹ سال

''کل بروز جمعہ کو ایک اہم بات بتائی جائے گی۔'' ابو جان نے چائے کی میز پر اعلان کے انداز میں کہا اور چائے ختم کر کے اٹھ کھڑے ہوئے۔ یہ سن کر سب گھر والے تجسس میں پڑ گئے۔

''واجد تمہیں کچھ معلوم ہے کہ ابو کیا بتائیں گے۔'' شمائلہ نے مارے تجسس کے واجد سے پوچھا۔

''مجھے کیا معلوم؟'' واجد نے جل کر شمائلہ سے کہا۔

''اور ہاں اس اہم بات کے بعد انعام بھی دیا جائے گا۔''

اب تو انعام کی لالچ میں سب سوچ میں پڑ گئے کہ اہم بات کیا ہے اور انعام کیا ہے؟

''صبیحہ! تمہیں کچھ بتایا ابو نے؟''

''ارے! میں بھی تمہاری صف میں شامل ہوں۔''

''ہیں ہماری صف! کیا مطلب؟'' واجد نے پوچھا۔

''ارے بھیا! نامعلوم لوگوں کی صف۔'' صبیحہ نے صف کی تشریح کرتے ہوئے کہا۔

''چلیں، سب امی کے پاس چلتے ہیں ابو نے ضرور انہیں بتا دیا ہو گا۔ ابو، امی کو تو ہر بات بتا دیتے ہیں۔'' سب نے مل کر متفقہ فیصلہ کیا اور امی سے پوچھنے چلے۔ ''ارے! تمہارے ابو نے مجھے بھی نہیں بتایا، بس اب انتظار کرو کل جمعہ کو پتا چل جائے گا۔'' امی جان نے بھی اپنی لاعلمی کا اظہار کیا۔

جمعے کے دن ناشتے کی میز پر سب جمع تھے۔ ناشتے کے بعد واجد نے کہا: ''ابو آپ نے انعام کا کہا تھا۔''

''بیٹو! انعام سے پہلے کچھ اعلان کا بھی کہا تھا۔'' صبیحہ نے اس کی تصحیح کرتے ہوئے کہا۔ امی ابو بے اختیار ہنس پڑے۔

''تو ہاں بچو! ہم نے آج ایک اہم بات بتانی ہے اور اس کے

بعد ایک اچھے انعام کا اعلان بھی کریں گے۔''

''جی جی...... جلدی سے بتائیے۔'' شمائلہ نے بے تاب ہو کر کہا۔ سب اس اعلان اور انعام کے متعلق جاننا چاہ رہے تھے۔

''واجد بیٹا! آج کیا دن ہے؟'' ابو نے پوچھا۔

''جی! کون سا مشکل سوال ہے؟ آج جمعہ ہے۔'' واجد نے مہارت جتلاتے ہوئے جواب دیا۔

''ہاں، یہی سننا چاہ رہا تھا کہ ذہن میں رہے کہ آج جمعہ ہے۔ اس جمعے کی مناسبت سے ایک واقعہ سنانا ہے، وہی اہم اعلان ہے یا اہم بات ہے۔'' ابو جان نے کہا۔

''ایک بادشاہ تھا۔ جس کا نام دقیانوس تھا۔ وہ اور اس کی ساری قوم بت پرست تھی۔ ایک روز ان کی قوم اپنے کسی مذہبی میلے کے لیے شہر سے باہر نکلی۔ جہاں ان کا سالانہ اجتماع ہوتا تھا۔ یہ لوگ وہاں بتوں کو پوجتے تھے اور ان کے لیے قربانیاں کرتے تھے۔ دقیانوس ظالم بادشاہ تھا سب کو بت پرستی پر مجبور کرتا تھا۔ اس میلے میں چند نوجوان لڑکے بھی گئے۔ وہاں ان لڑکوں نے دیکھا کہ اپنے ہاتھوں سے تراشے ہوئے پتھروں کو خدا سمجھتے ہیں ان کی عبادت کرتے ہیں۔

میرے ہاتھوں سے تراشے ہوئے پتھر کے صنم
آج بت خانے میں بھگوان بنے بیٹھے ہیں

اس وقت چند نوجوان لڑکوں کو اس عمل سے نفرت ہوئی، ان کو سمجھ آ گیا کہ عبادت صرف اس کی ہونی چاہیے جس نے زمین و آسمان اور اس کائنات کو بنایا ہے۔

چناں چہ ان میں سے ایک لڑکا وہاں سے ہٹا اور آ کر ایک درخت کے نیچے بیٹھ گیا۔ اس کے بعد دوسرا آیا وہ بھی اس درخت کے نیچے بیٹھ گیا اسی طرح تیسرا اور چوتھا لڑکا آتا گیا...... ہر ایک دوسرے سے اپنی بات چھپا رہے تھے کہ کہیں دوسرا جا کر بادشاہ کو نہ بتا دے اور وہ گرفتار ہو جائے۔ ان میں سے ایک نے کہا کہ ہمارا یہاں جمع ہونے کا کوئی نہ کوئی مقصد ضرور ہے سب بتا دیں، تاکہ پتا چل جائے کہ ہم یہاں کیوں جمع ہوئے ہیں۔

ان میں سے ایک بول اٹھا: ''جس بت پرستی میں ہماری قوم مبتلا ہے، یہ غلط ہے۔ عبادت تو صرف ایک اللہ کی ہونی چاہیے۔ جس کا اس کائنات میں کوئی ساجھی اور شریک نہیں ہے۔'' اور سب نے اپنا اپنا مقصد بھی یہی بتایا۔

ان نوجوانوں نے اپنی ایک الگ عبادت گاہ بنائی، جس میں یہ لوگ اللہ تعالیٰ کی عبادت کرنے لگے، مگر جلد ہی یہ خبر شہر میں پھیلتی چلی گئی اور چغل خوروں نے بادشاہ تک یہ خبر پہنچا دی۔

بادشاہ نے سب کو حاضر کرنے کا حکم فرمایا۔ یہ لوگ دربار میں حاضر ہو گئے۔ بادشاہ نے ان سے ان کا عقیدہ پوچھا تو انہوں نے بغیر کسی خوف سے اپنا عقیدہ توحید بیان کر دیا اور بادشاہ کو ایک اللہ کی عبادت کی دعوت دی۔

بادشاہ نے ان کو ڈرایا اور دھمکایا اور ان کے بدن سے عمدہ پوشاک جو ان کے بدن پر تھی، اتروا دی اور مہلت دے دی کہ اللہ کی عبادت کو چھوڑ دو، ورنہ تمہیں قتل کر دیا جائے گا۔ چناں چہ اس مہلت سے فائدہ اٹھاتے ہوئے یہ نوجوان بھاگ کر ایک غار میں چھپ گئے۔ اللہ تعالیٰ نے ان کو سلا دیا وہ تین سو نو (309) سال تک سوتے رہے۔ صبح و شام دھوپ ان کے قریب سے گزرتی، مگر غار کے اندر ان کے جسموں پر نہ پڑتی۔''

امی، شمائلہ، صبیحہ اور واجد ٹکٹکی باندھے اس عجیب و غریب واقعے کو سن رہے تھے۔ ''ابو! اتنا عرصہ وہ کیسے زندہ رہے؟'' واجد نے سوال کیا۔

''بیٹا! اللہ تعالیٰ جسے زندہ رکھے اسے کون مار سکتا ہے۔ اللہ تعالیٰ جو چاہتا ہے وہ کرتا ہے۔'' واجد کے سوال پر ابو نے جواب دیا، پھر اسی قصے کو جاری رکھتے ہوئے کہنے لگے:

''جب وہ نوجوان اٹھے تو اس وقت تک وہ ظالم بادشاہ مر چکا تھا۔ صدیاں گزر گئیں تھیں، اس وقت ملک پر ایک رحم دل بادشاہ بیدوسیس کی حکومت تھی۔

ایک ساتھی کو انہوں نے بازار کھانا وغیرہ خریدنے کے لیے بھیجا۔ وہ کھانا خریدنے دکان پر پہنچا اور تین سو برس پہلے بادشاہ دقیانوس کے زمانے کا سکہ کھانے کی قیمت میں پیش کیا تو دکان دار تعجب میں پڑ گیا کہ یہ سکہ کہاں سے آیا، کس زمانے کا ہے بازار کے دوسرے دکان داروں کو دکھایا۔ سب نے کہا کہ اس شخص کو کہیں پرانا خزانہ ہاتھ لگا ہے۔

اس نوجوان نے کہا: ''نہ مجھے کوئی خزانہ ملا ہے، نہ یہ کہیں سے لایا ہوں، یہ میرا اپنا روپیہ ہے۔'' بازار والوں نے گرفتار کر کے اسے بادشاہ کے سامنے پیش کر دیا۔ یہ بادشاہ تو نیک اور رحم دل تھا۔ اس نے سلطنت کے پرانے دفاتر کو نکلا جو کے اب آثار قدیمہ میں تبدیل ہو چکے تھے، اس میں اس کو وہ تختی ملی، جس میں ان نوجوانوں کے فرار ہو جانے کا واقعہ بھی لکھا ہوا تھا۔ (باقی آئندہ)

ویران جزیرے کا راز

قسط 6

احمد عدنان طارق

دن گزرتے گئے

لڑکیوں نے فیصلہ کیا تھا کہ وہ دونوں کمرے استعمال کریں گی۔ کمرے بہت چھوٹے تھے اور ویسے بھی آسان تھا کہ وہ دونوں اپنا اپنا کمرہ صاف رکھیں۔ تزئین کہنے لگی۔ ''اگر ہم اپنی تمام چیزیں ایک ہی کمرہ میں رکھ لیں تو وہاں بیٹھنے کو جگہ بھی نہیں بچے گی۔'' نایاب بھی اس بات سے اتفاق کرتی تھی۔ تزئین مینار والے کمرہ میں جا چکی تھیں اور وہ اسے پسند بھی کرتی تھیں۔ اسے ایسا کمرہ پسند تھا جس میں زیادہ کھڑکیاں ہوں، جہاں سے باہر نظر آتا رہے۔ اسے ایسے کمرے میں لیٹنا اچھا لگتا تھا جیسے وہ کھلے آسمان کے نیچے لیٹی ہوئی ہے۔ پھر اس نے کھڑکی سے باہر جھانکا تو ہوا اس کے بال اُڑا کر گزر گئی۔ لڑکیوں کے کمرے سے بھی سمندر نظر آتا تھا لیکن اس سمت کے مخالف جس سمت سے لڑکے سمندر کو دیکھ سکتے تھے۔ دکھ کا جزیرہ ان کے کمروں سے بالکل دکھائی نہیں دے سکتا تھا۔ عزیق نے صغیر کی باتیں نایاب کو بتائیں تو وہ سہم گئی۔ معاذ ہنستے ہوئے کہنے لگا۔ ''فکرمند ہونے کی ضرورت نہیں، صغیر اس طرح کے افسانوں پر یقین کرتا ہے اور کچھ کہانیاں خود بھی گڑھ لیتا ہے۔ ان کہانیوں میں کوئی حقیقت نہیں، یہ صرف لوگوں کو ڈرانے کے لیے بنائی گئی ہیں۔'' ساحل سمندر کے کنارے پہلی رات کے سونے کا تجربہ عجیب تھا۔ نایاب تو بڑی دیر تک جاگتی رہی اور چٹانوں کے ساتھ سر پٹختی لہروں کی آوازوں کا شور سنتی رہی۔

تند ہوا سیٹیوں کی آواز نکال رہی تھیں جو نایاب کو بہت اچھی لگ رہی تھیں۔ اس ماحول اور خاموشی والے قصبے میں کتنا فرق تھا جہاں تایا الیاس رہتے تھے، وہاں اتنی خاموشی تھی جیسے آدھی موت واقع ہو گئی ہو لیکن یہاں زندگی متحرک تھی، شور تھا۔ ان کے ہونٹوں پر سمندری نمک جم رہا تھا۔ ہوا میں طوفان سے تیزی تھی۔ ایسا لگتا تھا جیسے اس تنہا ساحل سمندر پر کسی وقت بھی کچھ ہونے والا ہے۔ عزیق بھی مینار والے کمرے میں جاگتا رہا۔ معاذ اس کے ساتھ گدے پر سویا ہوا تھا۔ پھر عزیق اُٹھا اور کھڑکی سے آ لگا۔ کمرے میں سے ہوا گزر رہی تھی۔ عزیق نے کھڑکی سے سر نکالا اور نیچے دیکھا۔ دُور چاند بادلوں سے گزر رہا تھا۔ نیچے بھنور بناتا پانی تھا، سیاہ چٹانوں سے لہریں ٹکرا رہی تھیں جس سے ہوا میں پھوار بلند ہو رہی تھی جو مینار والے کمرے میں عزیق کے چہرے کو گیلا کر رہی تھی۔ عزیق نے زبان سے پانی کو چکھا تو وہ بڑے مزے کا نمکین تھا۔ پھر ایک پرندہ رات کے اندھیرے میں چیخا جس کی آواز میں اداسی اور غم تھا لیکن عزیق کو پھر بھی پسند آیا۔ یہ کون سا پرندہ تھا، اسے معلوم نہیں تھا۔ عزیق سردی سے کانپنے لگا۔ ابھی گرمیاں تھیں لیکن

اس جگہ سمندر کے کنارے یہ گھر اس طرح بنایا گیا تھا کہ ہوا کا اس میں سے مکمل گزر ہو۔ پھر اچانک وہ بے اختیار اُچھلا، اسے ایسے لگا جیسے کسی نے اس کے شانے کو چھوا ہے۔ اس کا دل تیزی سے دھڑکنے لگا لیکن پھر اس کی ہنسی چھوٹ گئی کیوں کہ اسے چھونے والا بے چارہ کیکی تھا۔ کیکی ہمیشہ عزیق کے ساتھ ہی سوتا تھا۔ اکثر وہ اس کے پلنگ کے سرہانے بنی کسی چیز پر سو جاتا تھا اور وہ اپنے بڑے سر کو پَروں میں چھپا لیا کرتا تھا لیکن آج کوئی پلنگ تو تھا نہیں اور انہوں نے گدے زمین پر بچھائے ہوئے تھے۔ لہٰذا کیکی مجبوراً آج ایک الماری کے تھوڑے سے کھلے دروازے پر سویا ہوا تھا لیکن جب اس نے عزیق کے قدموں کی چاپ سنی تو وہ اپنی مستقل جگہ یعنی عزیق کے شانے پر آ کر بیٹھ گیا اور اس نے عزیق کو بھی حیران کر دیا۔ کیکی بولا۔ ''شرارتی لڑکے! بستر پر جاؤ۔'' عزیق مسکرایا۔

سب سے مزے کا لمحہ وہ ہوتا تھا جب کیکی کوئی ایسا فقرہ بولے جو حالات کے عین مطابق ہو۔ اب بھی وہ اتنی آہستگی سے بول رہا تھا جیسے کوشش کر رہا ہو کہ کہیں معاذ جاگ نہ جائے۔ عزیق بولا۔ ''کیکی کل میں تمہیں سونے کے لیے کوئی جگہ بنا دوں گا، تم اس الماری پر آرام سے نہیں سو سکتے، اب میں سونے لگا ہوں۔ کیسی عجیب رات ہے لیکن ہے مزے کی، ہے ناں!'' وہ بستر پر واپس آیا تو ٹھنڈ سے کانپ رہا تھا لیکن جلد ہی وہ معاذ کے ساتھ جڑ کر لیٹا تو گرم ہو گیا۔ پھر وہ سو گیا اور اسے ہزاروں پرندے خوابوں میں دکھائی دینے لگے جن کی تصویریں وہ کھینچنے والا تھا۔ شروع شروع میں یہاں کی زندگی عزیق اور نایاب کو عجیب لگتی رہی۔ بہت سال ہو گئے تھے ان کو ایک عام سے قصبے میں ایک عام سے مکان میں رہتے ہوئے لیکن یہاں بجلی نہیں تھی۔ ٹونٹیوں سے گرم اور ٹھنڈا پانی نہیں آتا تھا، یہاں اردگرد دُکانیں نہیں تھیں، یہاں تیل سے جلنے والی لالٹین تھی۔ گھر کے پیچھے ایک چھوٹا سا صحن بنا ہوا تھا جہاں کنواں تھا اور گھر والے اپنی پانی کی ضرورتیں پوری کرتے تھے۔ عزیق اور نایاب پانی چکھ کر پریشان ہو گئے کیوں کہ کنویں کے پانی میں نمک نہیں تھا۔ تزئین نے بتایا کہ یہ بالکل پینے کے قابل پانی ہے۔ اتنا مزے کا جتنا گرمیوں میں بچے برف ملا پیتے رہتے ہیں۔ عزیق نے جھک کر اندھے سیاہ کنویں میں جھانکا اور کہنے لگا۔ ''میں چاہتا ہوں کہ پانی نکالنے والی مشک پر بیٹھ کر جاؤں اور دیکھوں کہ کنواں آخر کتنا گہرا ہے۔'' تزئین نے کہا۔ ''لیکن یہ بہت مضحکہ خیز ہو گا، اگر تم اندر پھنس جاؤ اور اوپر نہ آ سکو۔ اب آؤ عزیق اور پانی کھینچنے میں میری مدد کرو اور ہر وقت خواب نہ دیکھا کرو۔ تم ہر وقت خوابوں میں ہی کھوئے رہتے ہو۔''

معاذ نزدیک کھڑے کہنے لگا۔ ''اور تم ہمیشہ جلد باز اور ہر کام میں بے صبری ہوتی ہو۔'' تزئین نے یہ سن کر اسے غصے سے گھورا۔ وہ بہت جلد غصے میں آ جاتی تھی اور اسے غصہ دلانا بہت آسان تھا۔ معاذ کی بات سن کر اس نے ترکی بہ ترکی جواب دیتے ہوئے کہا۔ ''اگر تمہیں اتنے کام کرنے کو دیئے جاتے جو مجھے اور نایاب کو کرنے کے لیے دیئے گئے ہیں تو تم بھی انہیں جلدی نپٹانے کی کوشش کرتے۔ آؤ نایاب چھوڑو لڑکوں کو تاکہ ہم اپنے کام نبٹائیں۔ لڑکے ویسے بھی اتنے اچھے نہیں ہوتے۔'' معاذ یہ باتیں سن کر اسے چیخ کر کہنے لگا۔ ''بہتر یہی ہے کہ تم چلے ہی جاؤ۔ اس سے پہلے کہ میں تمہیں ایک تھپڑ رسید کر دوں۔'' یہ کہہ کر وہ اپنے بچاؤ کے لیے تھوڑا سا پیچھے ہو کر کھڑا ہو گیا کہ مبادا تزئین اس پر جھپٹ پڑے۔ نایاب حیران و پریشان ہو کر ان کی طرف دیکھتی رہی۔ وہ دونوں لڑنے کے بعد اتنی ہی جلدی راضی ہو جاتے تھے اور ایسا لگتا تھا جیسے ان کے درمیان کبھی لڑائی نہ ہوئی ہو۔ تزئین کا صریحاً مقصد یہی تھا کہ صغیر ایک لمبی چیزوں کی خریداری کی فہرست لے اور کھٹارہ کار نکال کر مہینے میں دو دفعہ قریبی قصبے میں جائے اور وہ اگر کوئی چیز بھول جائے تو پھر یہ چیز اگلی دفعہ آ کر ہی لی جا سکتی تھی۔ سبزیاں صغیر چٹانوں کے درمیان ایک چھوٹی سی ہموار سطح پر خود سبزیاں بوتا تھا اور خود ہی کاشت کے تمام مراحل پورے کرتا تھا۔ ایک صبح نایاب نے مشورہ دیا کہ سب کو صغیر کے ساتھ گاڑی پر سیر کے لیے جانا چاہیے لیکن معاذ نے نفی میں سر ہلایا۔ وہ بولا۔ ''کوئی فائدہ نہیں، میں اور تزئین کئی دفعہ صغیر کو درخواست کر چکے ہیں لیکن وہ کبھی ہمیں ساتھ لے کر نہیں جاتا اور ہمیشہ انکار کر دیتا ہے اور کہتا ہے کہ اگر ہم نے کار میں گھسنے کی کوشش کی تو وہ ہمیں کار سے دھکا دے کر اُتار دے گا۔'' عزیق کہنے لگا۔ ''بوڑھا! میں حیران ہوں کہ تم اس کے ساتھ گزارا کیسے کرتے ہو۔'' تزئین کہنے لگی۔ ''اس لیے کہ اور کون ہو گا جو ایسی تنہا اور ویران جگہ پر ہمارے لیے کام کرے گا، ظاہر ہے کوئی نہیں۔ صغیر بھی نہ کرتا اگر وہ خود اتنا عجیب نہ ہوتا۔''

ان باتوں کے باوجود پھر بھی نایاب نے صغیر سے پوچھا۔ ''صغیر! مہربانی کر کے لے جاؤ۔'' پھر معصوم نظروں سے اسے دیکھنے لگی۔ اکثر وہ باتیں منوانے کے لیے ضد بھی کر لیتی تھی لیکن صغیر کے معاملے میں ایسا ممکن نہیں تھا۔ صغیر نے اپنی بات سختی سے دہرائی اور انکار کر کے وہاں سے روانہ ہو گیا۔ اس کے طاقتور ہاتھ تیزی سے آگے پیچھے ہو رہے تھے۔ نایاب اس کے پیچھے چلنے لگی۔ وہ کتنا ڈراؤنا تھا۔ آخر وہ کسی کو شاپنگ کرنے کے لیے ساتھ کیوں نہیں لے کر جاتا تھا؟ میرا خیال ہے صرف مردم بیزار ہونے کی وجہ سے وہ سوچ رہی تھی۔ بہت سی مشکلات ہونے کے باوجود ساحل سمندر پر رہنا بہت مزے کا عمل تھا۔ ہفتے میں صرف ایک بار انہیں نہانے کے لیے گرم پانی ملتا تھا۔ شکر ہے گرم پانی ہفتے میں ایک بار ملتا تھا وگرنہ سنگلاخ راستوں سے روزانہ جا کر برتنوں میں یہ پانی بھر کر لانا جوئے شیر لانے سے کم نہیں تھا۔ چچا آصف کا حال یہ تھا کہ کئی دفعہ وہ انہیں کھانے پر بھی نہیں ملتے تھے۔ ایک دن چچی ان کو ملانے کے لیے چچا کے مطالعہ والے کمرے میں لے گئیں تو انہیں یقین آیا کہ چچا بھی اس گھر میں رہتے ہیں۔ عزیق ہفتے میں ایک دفعہ پانی لا کر بھول گیا کہ اسے دوبارہ اگلے ہفتے پانی لانا بھی ہے یا نہیں، خصوصاً جب تک وہ یہاں رہتا ہے کیوں کہ وہ سمندر میں دن میں دو تین دفعہ نہا لیتا تھا۔ لڑکیاں گھر کا کام کرتی رہتی تھیں۔ چچی کھانا بناتی تھیں۔ لڑکوں کو کنویں سے پانی نکالنا ہوتا تھا۔ باورچی خانے میں آگ جلانے کے لیے لکڑیاں لانا ہوتی تھیں۔ تیل کے چولہوں میں تیل ڈالنا ہوتا تھا۔ وہ لالٹین لڑکیوں کے ساتھ باری باری صاف کرتے تھے۔ یہ کام کوئی نہیں کرنا چاہتا تھا کیوں کہ یہ کام کرتے ہوئے ان کے ہاتھ اور کپڑے بہت گندے ہو جاتے تھے۔ صغیر کار کو سنبھالتا تھا اور سبزیوں کو بھی۔

کئی دفعہ جھاڑ پونچھ، کھڑکیوں کی صفائی، جب وہ بہت گندی ہو جاتی تھیں اور اس کے علاوہ مختلف گھر کے کام بھی کرتا تھا۔ اس کی اپنی کشتی بھی تھی جو بہت مضبوط تھی۔ ایک دن عزیق نے پوچھا۔ ''کیا ہم بھی کبھی کشتی پر سوار ہو سکتے ہیں۔'' معاذ نے بتایا۔ ''کبھی نہیں، اور اجازت کے بغیر تو بالکل بھی نہیں۔ اگر تم نے ایسا کیا تو وہ تم پر ہاتھ بھی اُٹھا سکتا ہے۔ یہ کشتی تو اس کی آنکھوں کا تارہ ہے، ہمیں اس پر پیر رکھنے کی بھی اجازت نہیں ہے۔'' عزیق کشتی کو دیکھنے اس کے نزدیک گیا، یہ بہت خوبصورت کشتی تھی اور خاصی مالیت کی بھی ہو گی۔ اس پر نیا نیا رنگ کیا گیا تھا اور بہت اچھی حالت میں تھی۔ کشتی میں پتوار بھی تھے۔ مستول بھی تھا اور بادبان بھی، اور کشتی سے مچھلیاں پکڑنے کا بندوبست بھی تھا۔ عزیق کا دل مچل رہا تھا کہ کشتی کے اندر جا کر اسے دیکھے لیکن ابھی وہ کشتی کے نزدیک کھڑا سوچ ہی رہا تھا کہ وہ کشتی پر پاؤں رکھے یا نہیں اور اپنے پاؤں کے نیچے کشتی کو ڈولتا محسوس کرے لیکن اسی وقت صغیر معمول کے مطابق بکتا جھکتا نمودار ہوا۔ اس نے آتے ہی پوچھا۔ ''تم کیا کر رہے ہو، یہ میری کشتی ہے۔'' اس کی آنکھیں غصے سے اوپر چڑھ گئی تھیں اور ان کے اندر صرف سفید رنگ ہی نظر آ رہا تھا۔ عزیق بے صبری سے بولا۔ ''ٹھیک ہے، ٹھیک ہے لیکن کیا میں اسے اندر سے دیکھ سکتا ہوں؟'' صغیر دوبارہ غرّا کر بولا کہ ہرگز نہیں۔ کیکی بولا۔ ''شرارتی لڑکا!'' اور پھر صغیر کو دیکھ کر چیخا جو اسے ایسی نظروں سے دیکھ رہا تھا جیسے ابھی اس کی گردن ہی مروڑ دے گا۔ عزیق نے کہا۔ ''ٹھیک ہے، تم بہت اچھے آدمی ہو۔'' یہ کہہ کر وہ کشتی سے کچھ قدم پیچھے ہٹ گیا، وہ دل ہی دل میں صغیر کے رویے سے گویا خائف ہو گیا تھا۔ پھر وہ دوبارہ بولا۔ ''لیکن میں تمہیں ایک بات بتا دوں، میں کسی نہ کسی طرح کشتی پر بیٹھ جاؤں گا اور تم مجھے پکڑ نہیں سکو گے۔'' صغیر نے عزیق کی طرف دیکھا۔ اس نے غصے سے آدھی آنکھیں موندی ہوئی تھیں اور غصے سے اس کا چہرہ تمتما رہا تھا۔ وہ دل میں سوچ رہا تھا کہ تم نے اگر یہ حرکت کرنے کی کوشش کی تو وہ اسے ہر صورت روک لے گا۔

عجیب دریافت

اگر معاذ کے ساحل سمندر والے گھر میں صغیر نہ ہوتا تو جس طرح بچوں کی زندگی کا ایک معمول بن گیا تھا تو ماحول خوشگوار ہی رہنا تھا۔ وہاں ان کی مرضی کے کئی کام تھے جیسے چٹانوں کے درمیان قدرتی طور پر صاف پانی کے تالابوں میں تیراکی، چٹانوں کے درمیان بنے ہوئی تاریک غاریں، ڈوری اور بنسی سے کسی چٹان پر بیٹھ کر مچھلیاں پکڑنا کیوں کہ وہاں کئی دفعہ وہ خاصی بڑی مچھلیاں بھی پکڑ لیتے تھے لیکن صغیر کی موجودگی سے ان کے رنگ میں بھنگ پڑ جاتی تھی۔ اس کا ہر وقت بدتمیزی پر آمادہ رہنا اور جا بجا مداخلت

ان کو کھلتی رہتی تھی۔ اس کا ستا ہوا چہرہ برآمد ہوتا، اگر وہ مچھلیاں پکڑ رہے ہوتے تو وہ آ کر ان کا یہ کہہ کر دل توڑتا کہ وہ اپنا وقت ضائع کر رہے ہیں۔ ایک دن تنگ آ کر معاذ نے اسے کہا۔ ’’صغیر! تم ہمارا پیچھا کیوں نہیں چھوڑتے، تمہارا رویہ ہمارے ساتھ ایسا ہے جیسے تم ہمارے محافظ ہو خدا کے واسطے ہمیں ہماری مرضی سے جینے دو۔ ہم کسی کا کوئی نقصان نہیں کر رہے ہیں۔‘‘ صغیر نے روایتی دکھ دینے والے لہجے میں کہا۔ ’’تمہاری چچی نے مجھ سے کہا ہے کہ تم پر نظر رکھوں، انہوں نے مجھے حکم دیا ہے کہ تمہیں کسی خطرے میں پڑنے سے بچاؤں۔‘‘ معاذ نے ناراضگی سے اسے کہا۔ ’’میں نہیں مانتا۔ مجھے تو صرف اتنا معلوم ہے کہ تم خواہ مخواہ وہاں ٹانگ اڑاتے ہو جہاں ہم ہوتے ہیں اور ہمیں تنگ کرتے ہو۔ ہمارے معاملات میں دخل دینا بند کر دو، ہمیں یہ ہرگز پسند نہیں ہے۔‘‘

نایاب کے لیے یہ بہت متاثر کن تھا کیوں کہ وہ سمجھتی تھی کہ معاذ کا صغیر جیسے تگڑے بندے کے ساتھ اس طرح بات کرنا بڑی بہادری کی بات تھی۔ وہ واقعی ان کے لیے ایک مصیبت بن چکا تھا۔ اگر وہ اچھی طبیعت کا شخص ہوتا تو وہ بھی اس کی بڑی عزت کرتے۔ وہ اس کے ساتھ کشتی کی سیر کو جاتے اور مچھلیاں پکڑتے۔ وہ اس کے ساتھ زیادہ بہتر انداز میں مچھلیاں پکڑ سکتے تھے۔ وہ اس کے ساتھ کار میں جا کر پکنک منا سکتے تھے۔ نایاب بولی۔ ’’کیوں کہ یہ شخص بہت غصیلا اور ہٹ دھرم ہے، اس لیے اس کے ساتھ وقت تو گزارا ہی نہیں جا سکتا۔ ہوسکتا ہے ہم کشتی میں بیٹھ کر دکھوں کے جزیرے میں جاتے اور دیکھتے وہاں کیسے کیسے پرندے ہیں جیسا کہ عزریق کی خواہش ہے لیکن یہ سب جب ممکن تھا اگر صغیر اچھا انسان ہوتا۔‘‘ معاذ بولا۔ ’’لیکن حقیقت یہ ہے کہ وہ اچھا انسان نہیں ہے اور ہم کبھی بھی دکھ والے جزیرے میں نہیں جا سکتے۔ اگر ہم چلے بھی گئے تو میں شرط لگانے کو تیار ہوں کہ اتنی ویران جگہ پر کوئی پرندہ بھی نہیں ہو گا، لیکن آؤ چلیں اور اس بڑی غار کے اندر دیکھیں جو ہم نے کل دریافت کی تھی۔‘‘ ساحل پر غاروں میں پھرنا واقعی بڑے مزے کی بات تھی۔ کئی غاریں تو چٹانوں میں بہت گہرائی میں بنی ہوئی تھیں۔ کئی غاروں کی چھتوں میں بڑے بڑے سوراخ تھے۔ معاذ ان کو بتا رہا تھا کہ پرانے زمانے میں انسان ان غاروں کو چھپنے کے لیے استعمال کرتا تھا یا پھر اسمگلنگ کی چیزیں چھپا کر رکھتا تھا لیکن آج کل غاروں میں جڑی بوٹیوں اور گلے سڑے گھونگوں کے خولوں کے علاوہ کچھ نہیں ملتا۔ عزریق کہنے لگا۔ ’’ہمارے پاس ایک ٹارچ ہونی چاہیے تھی، میرے پاس موم بتیاں ختم ہو رہی ہیں، اگر نزدیک کوئی دُکان ہوتی تو ہم وہاں سے جا کر ایک ٹارچ خرید لیتے۔ میں نے صغیر کو شاپنگ پر جانے سے پہلے کہا بھی تھا لیکن وہ لے کر نہیں آیا۔‘‘ معاذ چلّایا۔ ’’ارے دیکھو، یہاں کتنی بڑی اسٹار فش ہے۔‘‘

تزئین کی چیخ نکل گئی، اسے رینگنے والی چیزوں سے بہت ڈر لگتا تھا جبکہ معاذ ان کو اتنا ہی پسند کرتا تھا۔ وہ کہنے لگی۔ ’’اسے مت چھوؤ اور میرے قریب ہرگز نہ لانا۔‘‘ لیکن معاذ کو بہن کو تنگ کرنے میں بہت مزا آتا تھا، اس نے فوراً اسٹار فش انگلیوں میں پکڑی اور تزئین کی طرف چلنے لگا۔ تزئین چیخ مار کر بھاگ کھڑی ہوئی۔ ’’تم بہت بدتمیز ہو، میں نے تمہیں کہا بھی ہے کہ اسے میرے پاس مت لاؤ۔ میں اسے مار دوں گی، اگر تم اسے میرے پاس لائے۔‘‘ معاذ کہنے لگا۔ ’’تم اسٹار فش کو کبھی نہیں مار سکتی، اگر تم اس کے دو حصے بھی کر دو گی تو دونوں حصے علیحدہ علیحدہ دو اسٹار فش بن جائیں گی، لہٰذا اب اسے دیکھو تو...... اسے سونگھو تو......اسے محسوس تو کرو۔‘‘ معاذ نے یہ کہہ کر وہ چیز بہن کے منہ کی طرف پھینک دی۔ تزئین اب سچ مچ غصے میں تھی۔ اس نے معاذ کو زور سے دھکا دیا جس سے توازن بگڑا اور وہ لڑکھڑا کر فرش پر جا گرا۔ معاذ کے منہ سے چیخ نکلی لیکن ساتھ کوئی اور بھی تکلیف سے بولا اور پھر خاموشی چھا گئی۔ عزریق نے پوچھا۔ ’’بودی والے لڑکے! تم خیریت سے تو ہو؟‘‘ یہ پوچھ کر اس نے موم بتی اونچی کر کے دیکھا لیکن یہ دیکھ کر وہ حیران رہ گیا کہ معاذ مکمل طور پر غائب ہو چکا تھا۔ اسٹار فش اُگی ہوئی جڑی بوٹیوں پر رینگ رہی تھی مگر معاذ کا دُور دُور تک نام و نشان نہیں تھا۔ تینوں بچے آنکھیں پھاڑے غار میں لٹکی جنگلی پودوں کی بیلیں دیکھ رہے تھے جو فرش تک جا رہی تھیں۔ وہ حیران تھے کہ آخر معاذ کدھر گیا۔ تزئین بہت خوفزدہ تھی۔ بے شک وہ چاہتی تھی کہ معاذ کو زور سے دھکا دے لیکن وہ یہ ہرگز نہیں چاہتی تھی کہ وہ دُنیا کے نقشے سے ہی سراسر غائب ہو جائے۔ اس نے زوردار چیخ ماری اور زور سے کہنے لگی۔ ’’معاذ! کیا تم چھپے ہوئے ہو، باہر نکلو بے وقوف۔‘‘ ایک دبی دبی آواز کہیں سے آئی۔ (باقی آئندہ) ☆☆☆

انجیر اور سائنس

انجیر کا قرآنی نام ’’تین‘‘ ہے۔ انگریزی میں "Fig" جب کہ نباتاتی نام "Ficus carica inn" ہے۔ انجیر ایک عمدہ میوہ ہے۔ طویل بیماری کے بعد صحت یابی کے لیے مفید سمجھا جاتا ہے۔ یہ طبیعت کو نرم اور بدن کو فربہ کرتا ہے۔ یہ شام، فلسطین، ایران، افغانستان، ہندوستان، ترکی، اسپین اور پاکستان میں پایا جاتا ہے۔ کتب مقدسہ، قرآن کریم اور احادیث میں بھی انجیر کا ذکر موجود ہے۔

انجیر ایک بہترین غذا ہے۔ زہر کے اثرات سے بچاتی ہے۔ حلق کی سوزش، سینہ کے بوجھ اور پھیپھڑوں کی سوجن میں مفید ہے۔ جگر اور تلی کو صاف کرتی ہے۔ بلغم کو نکالتی ہے۔ پیاس کو بجھاتی اور آنتوں کو نرم کرتی ہے۔ پیٹ سے ہوا کو نکالتی ہے اور پیشاب آور ہے۔

نبی کریم ﷺ نے انجیر کے متعلق فرمایا:

1- یہ بواسیر کو ختم کر دیتی ہے۔

2- جوڑوں کے درد میں مفید ہے۔

علاوہ ازیں انجیر دائمی قبض کے لیے لاجواب نسخہ ہے۔ خشک انجیر کو توے پر جلا کر دانتوں پر اس راکھ کا منجن کیا جائے تو دانتوں سے رنگ اور میل اتر جاتے ہیں۔ انجیر صبح نہار منہ کھانا عجیب و غریب فوائد کا حامل ہے۔

انجیر سے گلے کا علاج:

بعض اوقات سردی کی وجہ سے گلے میں ورم ہو کر گلے میں درد ہوتا ہے اور آواز نکلنا بند ہو جاتی ہے یا موٹی ہو جاتی ہے۔ انجیر کو پانی میں جوش دے کر بطور چائے پینا اس سلسلے میں مفید ہے۔ (نباتات قرآنی اور جدید سائنس)

(محمد ارسلان صدیقی، کراچی)

ہر حل کے ساتھ کوپن چسپاں کرنا ضروری ہے۔ آخری تاریخ 10/اکتوبر 2017ء ہے۔

کھوج لگائیے

نام: ______

شہر: ______

مکمل پتا: ______

موبائل نمبر: ______

ہر حل کے ساتھ کوپن چسپاں کرنا ضروری ہے۔ آخری تاریخ 10/اکتوبر 2017ء ہے۔

دماغ لڑاؤ

نام: ______

مقام: ______

مکمل پتا: ______

موبائل نمبر: ______

اکتوبر کا موضوع ’’برڈز شاپ‘‘ ارسال کرنے کی آخری تاریخ 08/اکتوبر 2017ء ہے۔

ہونہار مصور

نام ______ عمر ______

مکمل پتا: ______

موبائل نمبر: ______

میری زندگی کے مقاصد

کوپن پُر کرنا اور پاسپورٹ سائز رنگین تصویر بھیجنا ضروری ہے۔

نام ______ شہر ______

مقاصد ______

موبائل نمبر: ______

اوجھل خاکے

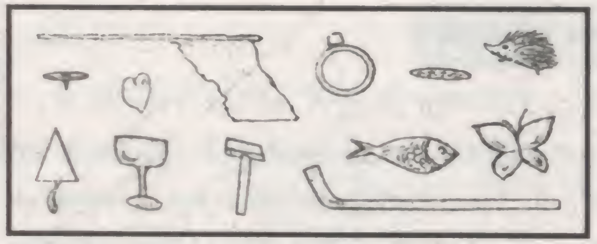

یہ چیزیں خاکے میں چھپی ہوئی ہیں۔ آپ ان چیزوں کو تلاش کیجیے اور شاباش لیجیے۔

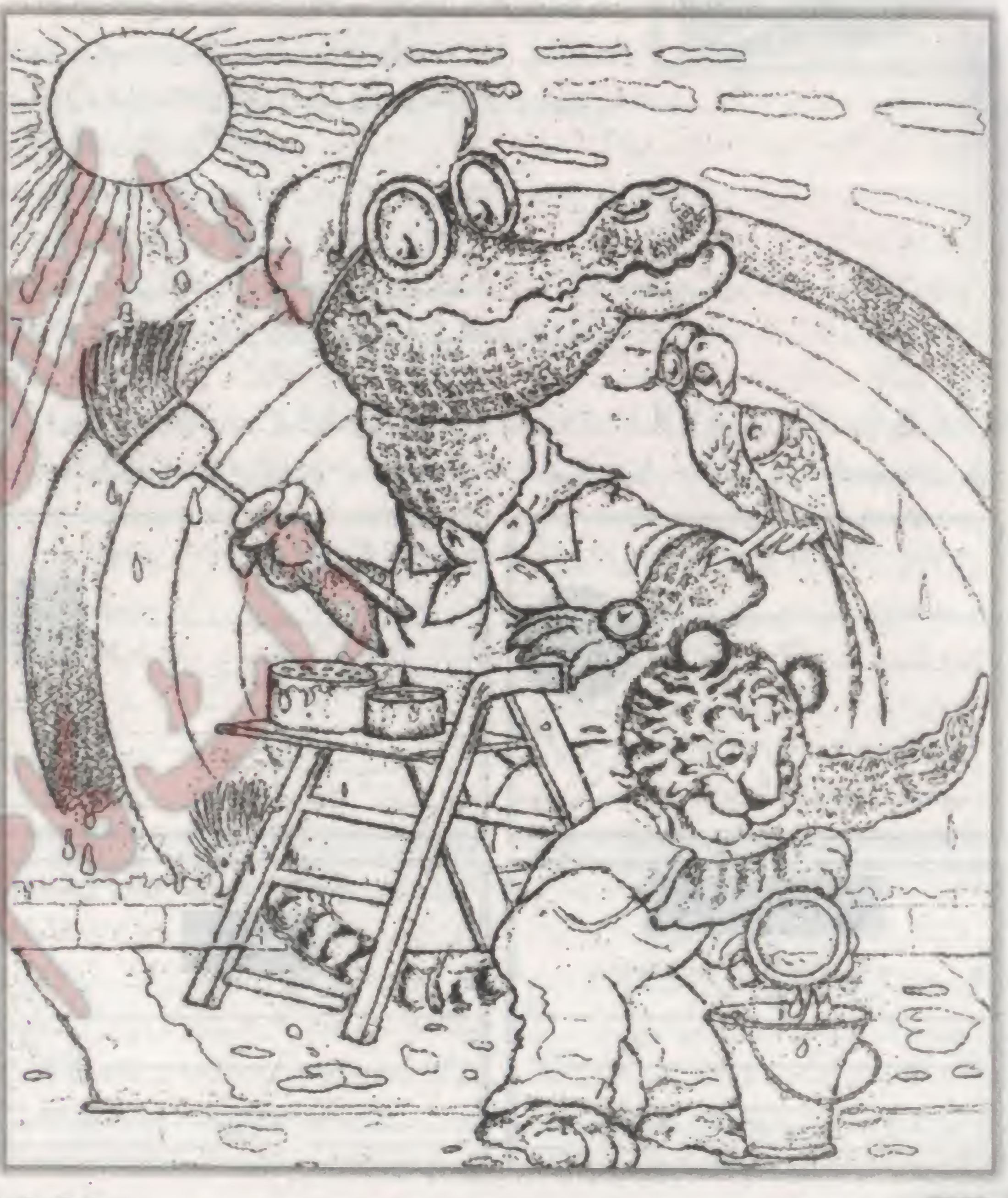

میری زندگی کے مقاصد

محمد رضوان، راول پنڈی
میں بڑا ہو کر فوجی بنوں گا اور اپنے ملک کی حفاظت کروں گا۔

محسن کبریا، سرائے عالم گیر
میں بڑا ہو کر فوجی بنوں گا اور اپنے ملک کی حفاظت کروں گا۔

سمیہ رانی، شرقپور شریف
میں پڑھ لکھ کر ایک استانی بننا چاہتی ہوں اور علم عام کرنا چاہتی ہوں۔

حافظ سلمان، لاہور
میں بڑا ہو کر باعمل عالم دین بنوں گا۔

طہٰ عاقل، وہاڑی
میں بڑا ہو کر پاکستان نیوی میں شامل ہو کر اپنے ملک کا دفاع کروں گا۔

توفیق الرحمن، سدھانور پورتھل
میں پائلٹ بن کر دشمن ملکوں سے بھرپور مقابلہ کروں گا۔

شعیب الرحمن، سرگودھا
جج بن کر ایمان داری سے میرٹ پر فیصلے کروں گا۔ ان شاء اللہ۔

حافظ محمد عمر عبداللہ، راول پنڈی
میں بڑا ہو کر ڈاکٹر بنوں گا اور والدین اور ملک و قوم کا نام روشن کروں گا۔ ان شاء اللہ۔

اقراء حسن، خیر پور ٹامیوالی
میں بڑی ہو کر ٹیچر بننا چاہتی ہوں اور غریب لوگوں کو مفت پڑھانا چاہتی ہوں۔

باسط فرید گھلو، ضلع جھنگ
میں پولیس آفیسر بن کر ملک و قوم کی خدمت کروں گا۔

حذیفہ مشرف، لاہور
میں اچھے کام کر کے اپنے خاندان کا نام روشن کروں گا۔

حمزہ فراز خان
میں بڑا ہو کر حافظ بنوں گا اور دین کی حفاظت کروں گا۔

قاضی رافع اللہ، کوٹ ادو
میں بڑا ہو کر ڈاکٹر بنوں گا۔

محمد خضر کامران، کراچی
اپنے ماں باپ کا فرماں بردار، اچھا مسلمان اور انجینیئر بنوں گا۔

ارحم شعیب، لاہور
میں بڑا ہو کر ڈاکٹر بنوں گا اور ملک کا نام روشن کروں گا۔

عمر ناصر، لاہور
میں ایک اچھا انسان بن کر دکھی انسانیت کی خدمت کروں گا۔

محمد ارسلان صدیقی، کراچی
میں بڑا ہو کر عالم دین بنوں گا۔

محمد ابراہیم، لاہور
میں بڑا ہو کر فوج میں جاؤں گا اور ملک کا نام روشن کروں گا۔

محمد ناصر، سدھانور پورتھل
میں ایک سچا مسلمان اور اچھا پاکستانی بن کر ملک کی خدمت کروں گا۔

حسنین علی، شیخوپورہ
میں فوجی جوان بن کر اپنے پیارے وطن اور اس میں رہنے والوں کی حفاظت کروں گا۔

عدینہ ہاشمی، بھول
ڈاکٹر بن کر غریبوں کا مفت علاج کروں گی، ان شاء اللہ۔

عتیق الرحمن، سدھانور پورتھل
میں پاک فوج میں شامل ہو کر ملک و قوم کا نام روشن کروں گا۔

ابوبکر اعظم، حویلی لکھا
میں بڑا ہو کر ڈاکٹر بنوں گا اور غریبوں کا مفت علاج کروں گا۔

عمار شاہ، فیصل آباد
فوجی افسر بن کر ملک کی حفاظت کروں گا۔

محمد عمر فاروق، سدھانور پورتھل
میں اعلیٰ تعلیم حاصل کر کے استاد بنوں گا اور ملک و قوم کی خدمت کروں گا۔

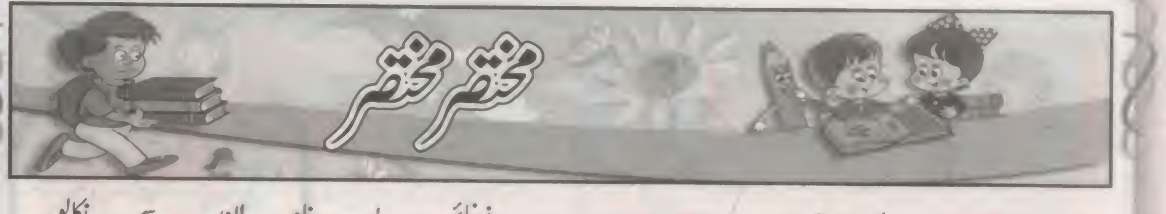

مبارک آنسو

حضرت حازمؓ سے نقل کیا گیا ہے کہ رسول اللہ ﷺ کے پاس ایک مرتبہ جبرئیل امین تشریف لائے تو وہاں ایک شخص اللہ کے خوف سے آنسو بہا رہا تھا۔ جبرئیل امین نے فرمایا کہ انسان کے تمام اعمال کا وزن ہوگا مگر آخرت کے خوف سے رونا ایسا عمل ہے جس کو تولا نہ جائے گا بلکہ ایک آنسو جہنم کی بڑی سے بڑی آگ بھی بجھا سکتا ہے۔ (فائزہ رزاق، خانیوال)

تلاوتِ قرآن

علامہ اقبالؒ فرماتے ہیں کہ میں روزانہ صبح تلاوت قرآن کیا کرتا تھا۔ میرے والد پاس سے گزرتے تھے۔ ایک دن رک کر مجھے فرمانے لگے: ''اقبال کسی دن تمہیں بتاؤں گا کہ تلاوت قرآن کیسے کرتے ہیں۔ اتنا کہہ کر وہ آگے بڑھ گئے اور میں حیران بیٹھا سوچنے لگا کہ میں بھی تو قرآن پڑھ رہا ہوں۔ کچھ دن بعد میں اسی طرح تلاوت کر رہا تھا کہ میرے والد میرے پاس رکے۔ جب میں خاموش ہوا تو وہ مجھے کہنے لگے: ''جب قرآن پڑھو تو یوں سمجھو جیسے یہ اللہ نے صرف تمہارے لیے بھیجا ہے اور اللہ براہ راست تمہارے ساتھ خطاب کر رہا ہے اور تمہاری زبان سے تمہیں احکامات دے رہا ہے۔ جب اس کیفیت کے ساتھ قرآن پڑھو گے کہ قرآن کا مخاطب اللہ ہے تو پھر تمہیں اس کی لذت ملے گی۔ اقبال فرماتے ہیں کہ: ''اس دن قرآن پڑھنے کی جو لذت مجھے ملی وہ پہلے کبھی نہ ملی تھی۔'' (مصباح صدف مبشر، جھنگ)

پہاڑ

پہاڑوں کے منظر یہ پیارے پیارے
بڑے خوب صورت ہیں دل کش نظارے
پہاڑوں سے ملے معدنی خزانہ
کہ جس سے فیض پائے زمانہ
پہاڑوں سے نکلتی آبشاریں
حسیں انداز سے جنگل سنواریں
ذخائر بے پناہ ان سے نکالو
انہی سے زندگی اپنی بنا لو
کہیں شیشہ، نمک، سونا بھرا ہے
کہیں ابرک کہیں کوئلہ پڑا ہے
پہاڑوں پر چڑھیں اور چڑھ نہ پائیں
یہی ڈر ہر گھڑی کہ گر نہ جائیں
پہاڑوں کے شکم میں شیر چیتے
یہیں پر زندگی پا کر ہیں جیتے
کبھی دھرتی پہ گرمی ہو جو پیارے
پہاڑوں پر چلے جاتے ہیں سارے

(شمشاد کوثری)

پرواہ اور لاپرواہی

حجاج بن یوسف کا مشہور واقعہ ہے کہ اس نے ایک نابینا کو خانہ کعبہ کا غلاف پکڑتے ہوئے دیکھا تو پوچھا کیا کر رہے ہو؟ اس نے کہا کہ میں بیس سال سے اللہ سے اپنی بینائی کی دعا کر رہا ہوں۔ حجاج نے تعجب سے کہا۔ ''اتنی مدت سے نہ تیری دعا قبول ہوئی اور نہ تجھے اس کا بدلہ ملا۔ ''ایسا نہیں ہو سکتا، دیکھو یہ تلوار ہے اس کو اپنے پاس رکھو۔ میں تین دن کے بعد آؤں گا اگر تیری دعا قبول نہ ہوئی تو تجھے قتل کر دوں گا۔'' تین دن بعد حجاج بن یوسف واپس آیا تو وہ شخص بینا ہو چکا تھا۔ حجاج نے۔ ''بیس سال کی بے پرواہی کی دعا اور تین دن کی دل لگتی دعا میں یہی فرق ہے۔'' (سارہ ارشد، سرگودھا)

حیران کن معلومات

1- بیتھوون، جو کہ دنیا کے معروف ترین موسیقاروں میں سے مانا جاتا ہے، سننے کی صلاحیت نہیں رکھتا تھا۔
2- شہد دنیا کی واحد چیز ہے جو کہ وقت کے ساتھ ساتھ خراب نہیں ہوتی۔ بننے کے بعد شہد 3000 سال تک استعمال کیا جا سکتا ہے۔
3- تحقیق کاروں کے مطابق زمین سے بہت فاصلے پر ایک سیارہ

ملا ہے جو کہ پورے کا پورا ''ہیرے'' سے بنا ہوا ہے۔
4- انسانوں کے علاوہ دوسرے جانور مثلاً بندر اور ڈولفن بھی خودکشی کرتے ہیں۔
5- بندر کے دو دماغ ہوتے ہیں۔ آکٹوپس کے دو دل ہوتے ہیں۔

(ایمان فاطمہ، لاہور)

نعت رسول مقبول ﷺ

مدینے پہ رحمت تمام ہو گئی ہے
مدینے کی خوش بو دوام ہو گئی ہے
خلقت کو تھی جس حق کی تلاش
عرب پہ خدا کا انعام ہو گئی ہے
یتیموں کے دل کو، غریبوں کی جاں کو
آقا ﷺ کی مدد عام ہو گئی ہے
ولادت نبی ﷺ بہار ایسی لائی
ہر شے رنگیں، گل فام ہو گئی ہے
واہ! کیا آمد رسولِ عربی ﷺ
جہالت کی عمارت منہدم ہو گئی ہے
یہی منظورِ خدا تھا کہ ہاشمؔ
محمد ﷺ کی زباں پیام ہو گئی ہے

(شاعر: ہاشم حسین، ذیشان اشرف، کبیر والا)

حضرت عمر بن عبدالعزیزؒ کی سادگی

حضرت عمر بن عبدالعزیزؒ ایک مرتبہ اپنی بچیوں سے ملنے گئے تو دیکھا جو بچی ان سے بات کرتی ہے وہ اپنے منہ پر ہاتھ رکھ لیتی ہے، سبب دریافت کیا تو معلوم ہوا کہ ان بچیوں نے آج صرف دال اور پیاز کھائی ہے، رو کر فرمایا کہ کیا تم اس پر راضی ہو کہ تم انواع و اقسام کے کھانے کھاؤ اور تمہارا باپ جہنم میں جائے؟ یہ سن کر وہ بھی رو پڑیں۔ اس وقت جب کہ وہ روئے زمین کی سب سے بڑی سلطنت کے حکمران تھے ان کی ذاتی ملکیت کا یہ حال تھا کہ باوجود شوق کے حج کا خرچ ان کے پاس نہ تھا، نوکر سے جو ان کا سچا رفیق تھا، پوچھا کہ تمہارے پاس کچھ ہے؟ اس نے کہا کہ دس بارہ دینار، کہا کہ اس میں حج کیسے ہو سکتا ہے؟ اس کے بعد ایک بڑی خاندانی مالیت آئی تو خادم نے مبارک باد دی، اور کہا کہ حج کا سامان آ گیا، فرمایا کہ ہم نے اس مال سے بہت دنوں فائدہ اٹھایا ہے، اب یہ مسلمانوں کا حق ہے، یہ کہہ کر اس کو بیت المال میں داخل کر دیا۔ (احور کامران، لاہور)

لاحول ولاقوۃ کا عمل

حضرت ابن عباسؓ سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ جسے غم و فکر گھیر لیں اسے چاہیے کہ وہ لاحول ولاقوۃ بکثرت پڑھے، علماء عظام فرماتے ہیں کہ اس کلمہ کے عمل سے بڑھ کر کوئی چیز نہیں۔

(کظیمہ زہرہ، لاہور)

تمام اساتذہ کی نذر (5 اکتوبر، اساتذہ کا عالمی دن)

اے دوستو ملیں تو بس اک پیام کہنا
استاد محترم کو میرا سلام کہنا
کتنی محبتوں سے پہلا سبق پڑھایا
میں کچھ نہ جانتا تھا سب کچھ مجھے سکھایا
ان پڑھ تھا اور جاہل قابل مجھے بنایا
دنیائے علم و دانش کا راستہ دکھایا
مجھ کو خبر نہیں تھی آیا ہوں میں کہاں سے
ماں باپ اس زمیں پر لائے تھے آسماں سے
پہنچا دیا فلک تک استاد نے یہاں سے
واقف نہ تھا ذرا بھی اتنے بڑے جہاں سے
مجھ کو دلایا کتنا اچھا مقام کہنا
جینے کا فن سکھایا مرنے کا بانکپن بھی
عزت کے گر بتائے رسوائی کے چلن بھی
کانٹے بھی راہ میں ہیں پھولوں کی انجمن میں
تم فخر قوم بننا اور نازش چمن بھی
ہے یاد مجھ کو ان کا اک اک کلام کہنا
جو علم کا عمل ہے استاد کی عطا ہے
ہاتھوں میں جو قلم ہے استاد کی عطا ہے
جو فکر تازہ دم ہے استاد کی عطا ہے
ان کی عطا سے چمکا ہم سب کا نام کہنا
استاد محترم کو میرا سلام کہنا

(زیب النساء، راہوالی کینٹ)

☆☆☆

شنگھائی سٹی

شنگھائی (Shanghai) چین کا گنجان آباد ترین شہر ہے جس کی آبادی 2014ء کی مردم شماری کے مطابق ڈھائی کروڑ کے لگ بھگ ہے۔ اس شہر کو "مشرق کا پیرس" بھی کہا جاتا ہے۔ یہ چین کا بڑا تجارتی مرکز ہے۔ یہاں فیکٹریوں اور صنعتوں کا جال بچھا

ہے۔ لاہور کی طرح اس شہر میں بھی چار موسم آتے ہیں۔ سنگاپور، ہانگ کانگ اور ٹوکیو کے بعد ایشیاء میں تجارت کا سب سے بڑا مرکز یہی شہر ہے۔ کیوں کہ اس شہر کے ایک طرف دریائے "Yangtze" بہتا ہے۔ اس لیے یہاں دنیا کا سب سے معروف کارگو کنٹینر یا "Container Terminal" بھی اسی شہر میں ہے۔ اس شہر میں بدھ مت مذہب کی آبادی زیادہ ہے۔ مسلمانوں کی تعداد نہایت کم ہے۔ البتہ 1295ء میں یہاں ایک مسجد قائم کی گئی تھی۔ تاہم کیتھولک فرقے کے عیسائیوں کی بڑی تعداد بھی اس شہر کی رہائشی ہے۔ سٹی کا رقبہ $6341K^2$ کلو میٹر ہے۔ لفظ شنگھائی کا مطلب ہے۔ "Upon the Sea" دنیا بھر میں ہر سال 31 اکتوبر کو ورلڈ سٹی ڈے منایا جاتا ہے۔

ڈوڈو پرندہ

ڈوڈو پرندہ (Dodo bird) ایک بھاگنے دوڑنے والا پرندہ تھا جو اب دنیا سے ناپید (Extinct) ہو گیا ہے۔ اس کا سائنسی نام "Raphus Cucullatus" ہے اور اس کی کلاس "Aves" ہے۔ فطری طور پر یہ ماریشیس، مڈگاسکر (Madagascar) اور بحرۂ ہند کے جزائر پر موجود تھا۔ کبوتر اور بطخ کا شمار بھی اس پرندے کے قریبی

رشتہ داروں (relatives) میں ہوتا ہے۔ یہ پرندہ اڑ نہیں سکتا تھا۔ اس پرندے کے بارے میں سب سے پہلے ہالینڈ کے ملاح نے 1598ء میں انڈونیشیاء کے ساحلی علاقوں میں موجودگی کا بتایا۔ خیال کیا جاتا ہے کہ ڈوڈو پرندے کے پَر سرمئی اور بھورے رنگ کے تھے۔ سر سرمئی رنگت کا تھا اور بطخ کی طرح سر پر زیادہ "feathers" نہ تھے۔ اس کے نر جسامت میں بڑے تھے۔ ان کا وزن 37 سے 46 پاؤنڈ (17 سے 21 کلو) ہوتا تھا۔ جب کہ مادہ کا وزن 23 سے 39 پاؤنڈ (11 سے 18 کلو) تک ہوتا تھا۔ زمین پر پڑے پھل، بیج، جڑیں وغیرہ ان کی مرغوب غذا تھی۔ تنظیم "دی سنٹر فار بیالوجیکل ڈائیورسٹی (Diversity)" ہر سال ایسے افراد کو "Dodo Award" سے نوازتی ہے جو جان داروں کے تحفظ اور ماحول کے لیے خدمات سرانجام دیتے ہیں۔ 1896ء میں ایک شاعر "Hilarie Belloc" نے اس پرندے پر نظم لکھی تھی۔

بال پوائنٹ

وقت کے ساتھ ساتھ لکھنے لکھانے کے لیے کئی انداز کے قلم میسر آئے جن میں سے آج کل بال پوائنٹ قلم (Ball point pen) بکثرت استعمال ہوتا ہے۔ یہ ایسا قلم ہے جسے بیرو بھی کہا جاتا ہے۔ اس قلم میں ایک دھاتی نوک پر سیاہی استعمال ہوتی ہے۔ یہ نوک گیندنما ہونے کی وجہ سے اسے بال پوائنٹ کہتے ہیں۔ دنیا کا پہلا باضابطہ متعارف کردہ بال پوائنٹ 30 اکتوبر 1888ء کو "John J. Loud" نے Patent کروایا۔ اس قلم کی نوک پر دھاتی نوک متعارف کرنے سے ایک ایسا تحریری آلہ ایجاد ہوا جو ایسی سطح پر بھی لکھ سکتا ہے جس پر عام قلم سے لکھنا مشکل ہے۔

مارکیٹ میں ڈسپوزیبل اور ری فل ایبل بال پوائنٹ دستیاب ہیں اور ان کی بے شمار ورائٹی موجود ہے۔ بال پوائنٹ کو عربی میں "قلم جرجاف" اور فارسی میں "خودکار قلم" کہتے ہیں۔ ایسے بال پوائنٹ قلم جن میں سیاہی جمتی نہیں 15 جون 1938ء کو برطانوی کمپنی "Biro" نے کامیابی سے مارکیٹ میں پیش کیا۔ اس قلم کی خاص بات یہ بھی ہے سطح سمندر سے بلندی پہ یہ فاونٹین قلم کی طرح لیک (Leak) نہیں کرتے۔ بال پوائنٹ بنانے والے John J. Loud 2 نومبر 1844ء کو پیدا ہوئے اور 10 اگست 1916ء کو امریکہ کے شہر ویماوتو میسا چوسٹس (Weymouth Massachseuttes) میں وفات پائی۔

آغا شورش کاشمیری

اردو ادب کے معروف شاعر و صحافی، خطیب و سیاست دان آغا شورش کاشمیری 14 اگست 1917ء کو لاہور میں پیدا ہوئے۔ آپ کا اصل نام "عبدالکریم" تھا۔ آپ میٹرک تک تعلیم حاصل کرنے کے بعد مولانا ظفر علی خاں کے قریب رہے اور صحافت و سیاست کے رموز سیکھے۔ یہی وجہ ہے کہ آپ قلمی لحاظ سے "زمیندار" اخبار سے خاصا کچھ سیکھے۔ نبی کریم حضرت محمد ﷺ سے والہانہ عشق کی بدولت آپ

نے نعت گوئی بھی کی۔ جن دنوں آل انڈیا مسلم لیگ علیحدہ وطن کے لیے سرگرم تھی۔ ان دنوں آغا صاحب مجلس احرار میں شامل تھے اور شعلہ بیانی کی وجہ سے مقبول ہوئے۔ آپ کی شادی "خورشید بیگم" نامی خاتون سے ہوئی۔ آپ نے مجلس احرار کے پلیٹ فارم سے خوب نام کمایا اور 1946ء میں اس تنظیم کے سیکرٹری جنرل بنے۔ آپ نے 1974ء میں تحریک ختم نبوتؐ میں بھی بڑھ چڑھ کر حصہ لیا۔ آپ پاکستان کے معروف جریدے "چٹان" کے چیف ایڈیٹر بھی رہے۔ "اس بازار میں"، "فن خطابت" سمیت کئی کتابیں، نظمیں اور نعتیں لکھیں۔ 25 اکتوبر 1975ء کو لاہور میں انتقال کر گئے۔ لاہور میں ایک شاہراہ کا نام آغا شورش کاشمیری روڈ رکھا گیا ہے۔ ☆☆☆

ریل گاڑی

آج جتنے عرصے میں ہم پاکستان کے ایک سرے سے دوسرے سرے تک جا پہنچتے ہیں، سو سال پہلے اتنے ہی وقت میں لاہور سے صرف پشاور پہنچا کرتے تھے۔

جب ہم برگد کا درخت دیکھتے ہیں جس کی پھیلی شاخوں اور چوڑے چکلے پتوں نے زمین کے ایک اچھے خاصے ٹکڑے کو گھیرے میں لے رکھا ہے، یا کھجور کا درخت جس کی چوٹی آسمان سے باتیں کر رہی ہے تو یہ قیاس میں لانا مشکل ہو جاتا ہے کہ یہ سب ایک ننھے سے بیج کا کرشمہ ہیں۔

بالکل یہی حالت آج کل کے دیو جیسے اور تیز رفتار ریلوے انجنوں کی ہے، جن کی حقیقت آج سے کچھ عرصہ پہلے کچھ بھی نہ تھی۔

ہمیں ان سائنس دانوں کی ہمت، صبر اور استقلال کی داد دینی چاہیے جنہوں نے ان تھک کوششوں سے بھاپ کو انسان کا غلام بنا دیا اور لوہے کی پٹڑی پر لوہے کے بڑے بڑے انجن دوڑا دیے۔

انگلستان میں 1650ء میں لوہے کی پٹڑی پر پہیے دار گاڑیاں چلنے لگی تھیں۔ انہیں گھوڑے کھینچتے تھے اور ان میں کانوں سے کوئلہ ڈھویا جاتا تھا۔ لندن میں ایک سواری پٹڑی پر چلتی تھی۔ اسے بھی گھوڑے کھینچتے تھے۔

جب سائنس دانوں نے بھاپ کی طاقت کا راز معلوم کر لیا تو انہوں نے بھاپ سے چلنے والا انجن بنانے کی ٹھانی، جو گھوڑے کی جگہ لے سکے۔ اس قسم کے انجن کی ایجاد میں بہت سے سائنس دانوں کا ہاتھ ہے۔ انہی میں سے ایک انگریز، ٹری وی تھک، تھا جس نے 1804ء میں بھاپ کا انجن بنانے کی کوشش کی۔ مگر جارج اسٹیفن سن ان سب سے بازی لے گیا۔ جارج اسٹیفن سن بھی انگریز ہی تھا۔

اسٹیفن سن کو بچپن ہی سے انجنوں سے بہت لگاؤ تھا اور وہ ان کے کل پرزوں کو دیکھتا بھالتا رہتا تھا۔ آخر وہ سال ہا سال کی محنت کے بعد، 1815ء میں ایک ایسا انجن بنانے میں کام یاب ہو گیا جو بھاپ سے چلتا اور پٹڑی پر دوڑتا تھا۔ اس انجن کا نام راکٹ تھا۔

1825ء میں انگلستان میں پہلی ریلوے لائن بچھائی گئی تو اس پر اسٹیفن سن ہی کا انجن چلایا گیا۔ اس انجن نے 1829ء میں 36 میل فی گھنٹے کی رفتار سے دوڑ کر 500 پاؤنڈ کا انعام حاصل کیا۔

1830ء میں امریکا میں ایک شخص نے پٹڑی پر چلنے والا انجن تیار کیا اور ایک بگھی سے اس کی دوڑ لگائی۔ لیکن ایک رکاوٹ پیش آنے کے سبب بگھی آگے نکل گئی۔ اس انجن کے مالک کو بہت افسوس رہا لیکن یہ بات ثابت ہو گئی کہ گاڑیوں کا بے جان گھوڑا جان دار گھوڑے پر فوقیت رکھتا ہے۔

1830ء اور 1831ء میں اور بھی انجن بنائے گئے جن سے گاڑیاں کھینچنے کا کام لیا جانے لگا۔ اس سے پہلے تمام انجن جن ڈبوں کو کھینچتے تھے وہ صرف مال اسباب ڈھونے کے لیے ہوتے تھے۔ آدمیوں کے بیٹھنے کی ان میں جگہ نہ ہوتی تھی لیکن ان انجنوں میں ایسے ڈبے بھی لگائے جانے لگے جن میں آدمی بھی بیٹھ سکتے تھے۔ البتہ یہ تکلیف ابھی باقی تھی کہ جب انجن چلتے چلتے ایک دم کھڑا ہوتا یا کھڑے کھڑے اچانک چل پڑتا تو مارے ہچکولوں کے سواریاں آپس میں ٹکرا جاتی تھیں اور انہیں سخت تکلیف اٹھانی پڑتی تھی۔ سواریوں کو ایک تکلیف کا سامنا اور بھی تھا۔ اکثر اوقات جنگل میں چلتے چلتے انجن کا ایندھن ختم ہو جاتا تھا۔ ایسے وقت میں سواریوں کو اتر کر جنگل سے لکڑیاں لا کر انجن کی خوراک کا انتظام کرنا پڑتا تھا۔

دھیرے دھیرے ان سب مشکلات پر قابو پا لیا گیا اور ایسے انجن بنائے گئے جو بہت طاقت ور بھی تھے اور چلنے میں ہچکولے بھی کم لگتے تھے۔ اب ہر ملک میں ایک سے ایک بہتر انجن بننے لگے اور اس قدر بنے کہ بجائے ناموں کے انہیں نمبروں سے پکارا جانے لگا۔

اول اول تو انسان اور جانور انجنوں سے غیر مانوس رہے، مگر آخر سب کو عادت پڑ گئی اور اب یہ حال ہو گیا کہ جانور ریل کی پٹڑی پر آ کر کھڑے ہو جایا کرتے، جنہیں ہٹانے کے لیے انجن کو ڈراونی آوازیں نکالنی پڑتی تھیں۔ مگر بعض اوقات جانور پٹڑی پر سے نہ ہٹتا اور مجبوراً گاڑی کو روکنا پڑتا۔ اس تکلیف سے بچنے کے لیے انسان نے ایک ایسا پرزہ ایجاد کیا جو گائے بھینس اور دوسری رکاوٹوں کو انجن کے سامنے آئیں، اٹھا کر دائیں بائیں پھینک دے۔

آخر وہ وقت بھی آ گیا جب برصغیر پاک و ہند میں ریل کی پٹڑی کا جال بچھنا شروع ہوا۔ سب سے پہلے ہندوستان میں 1845ء میں کلکتے سے رانی گنج، بمبئی سے کلیان اور مدراس سے ارکونام تک ریل کی پٹڑیاں بچھائی گئیں۔ 1859ء میں آٹھ کمپنیوں کو پانچ ہزار میل ریلوے لائن تیار کرنے کا ٹھیکا دیا گیا۔ 1860ء میں کراچی سے کوٹری تک تقریباً 150 میل لمبی پٹڑی بچھائی گئی۔ یہ پاکستان میں پہلی ریلوے لائن تھی۔

جب سے اب تک ریلوے انجنوں نے بہت ترقی کی ہے۔ پہلے پہل بھاپ کے انجن بنے، پھر ان کی جگہ ڈیزل سے چلنے والے انجنوں نے لے لی۔ اس کے بعد بجلی سے چلنے والے انجن بن گئے۔ ڈیزل اور بجلی کے انجن بھاپ کے انجنوں کے مقابلے میں بہت تیز رفتار اور ہلکے پھلکے ہوتے ہیں۔

ریلوں کی بدولت جغرافیائی امتیاز مٹ گئے ہیں۔ گوشے گوشے کے آدمی آپس کے میل جول سے اتحاد و الفت کی لڑی میں پرو دیئے گئے ہیں۔ اس لحاظ سے ریل بہت مفید ثابت ہوئی ہے۔

جس طرح انجنوں کی شکل و صورت، طاقت اور رفتار میں اضافے ہوئے، اسی طرح ریل کے ڈبوں میں بھی طرح طرح کی تبدیلیاں کر کے انہیں بہتر بنانے کی کوشش کی گئی۔ آج کل کی گاڑیوں کے ڈبوں میں بجلی کے پنکھے، نرم نرم گدیلے، میز، کرسیاں، سردی، گرمی اور ریت سے حفاظت کے سامان مہیا کیے گئے ہیں۔ نہانے کے لیے غسل خانے اور لمبے سفروں میں گاڑیوں کے ساتھ کھانے کے ڈبے بھی ہوتے ہیں۔ ☆☆☆

بلاعنوان کے دیگر "دل چسپ" جملے

- تیری نہیں محتاج کشتی کا جسے مچھلی خدا نے دی۔
(شیخ نافع احسان محصی، ملتان)
- اندھا کیا چاہے دو آنکھیں (محمد فاروق رومی، لاہور)
- ڈوبتے کو ڈولفن کا سہارا ڈر رہا ہے ملاح بے چارا
(سعدیہ اشرف آرائیں، کبیر والا)
- ہمت ہے تو پکڑ کر دکھاؤ اب تم آگے نکل کر دکھاؤ
(مرزا حیات بیگ، حیدر آباد)
- ترکیب لاجواب جیت بے مثال (ماہ رُخ، حیدر آباد)
- کیوں ہوتے ہو حیران یہ ہے ڈولفن مچھلی کا کمال
(مرزا تیمور بیگ، حیدر آباد)
- کر لو مجھ سے یاری کروا دوں گا مچھلی کی سواری
(صفی الرحمن، لاہور)
- بیٹھ کر جو چلے ہم مچھلی کی سواری پھر نہ جیت پائے گی تیری سواری
(محمد ابوبکر صدیق، فیصل آباد)
- ساحل پہ کھڑے ہو تمہیں کیا غم ہے چلے جانا
میں ڈوب رہا ہوں ابھی ڈوبا تو نہیں ہوں
(کبشہ ادریس، کراچی)

ضرب المثل کہانی

تمہارے منہ میں گھی شکر

زبیدہ سلطانہ

ظفر دوڑا دوڑا آیا۔ سانس پھولی ہوئی تھی۔ خوشی کے مارے چہرہ سرخ ہو رہا تھا۔ ''امی جی! امی جی!!!''

اس نے صحن میں گھستے ہی پکارا۔ امی کچن میں تھیں۔ ہاتھوں پر گھی لگا ہوا تھا۔ وہ آج بیٹی کی فرمائش پر مکئی کی میٹھی چوری بنا رہی تھیں۔ ظفر اندر آتے ہی ماں سے لپٹ گیا۔

''امی! منہ میٹھا کرائیں تو آپ کو خوش خبری سناؤں۔''

ماں نے ہنستے ہوئے گھی بھرے ہاتھ سے شکر کی چٹکی اس کے منہ میں ڈال کر کہا:

''لو بسم اللہ کرو! تمہارا منہ میٹھا کرا دیا۔''

''واہ! یہ منہ میٹھا کرایا ہے؟'' ظفر بولا۔

''اور کیا...... تمہارے منہ میں گھی شکر ڈالا ہے، اس سے اچھا اور کیا میٹھا ہو گا؟'' ماں نے کہا۔

''اچھا اب آپ بوجھیں کہ میں آپ کو کیا خبر سنانے والا ہوں۔'' ظفر شرارت سے بولا۔

ماں نے تجسس اور مسرت سے پوچھا: ''اب جو بھی خبر ہے، جلدی سناؤ۔ میں زیادہ انتظار نہیں کر سکتی۔''

''اچھا تو پھر آپ کو مبارک ہو، بڑے بھیا ایم۔ اے میں پاس ہو گئے ہیں۔''

اتنے ہی میں ظفر کا بڑا بھائی مظفر ہنستا ہوا اندر آیا۔ جوش مسرت سے ماں نے گلے لگا لیا۔ ظفر نے گھی سے تر شکر کا چمچ بھائی کے منہ میں ٹھونستے ہوئے ہنس کر کہا: ''بھیا لیجئے، اب آپ کے منہ میں بھی گھی شکر، اب بتایئے کتنے نمبر آئے ہیں؟''

یہ فقرہ دراصل ایک محاورہ ہے۔ جب کوئی اچھی خبر سنائے یا نیک تمنا ظاہر کرے تو خوشی سے کہتے ہیں کہ تمہارے منہ میں گھی شکر۔ ☆☆☆

دنیا سات چیزوں پر قائم ہے

- ☆ خدائے کریم کی رحمت سے
- ☆ رسول کریمؐ کی رسالت سے
- ☆ حکماء کی عقل و حکمت سے
- ☆ عابدوں کی عبادت سے
- ☆ عالموں کی بلند عظمت سے
- ☆ بادشاہوں کی سیاست اور عدالت سے
- ☆ بہادروں کی شجاعت اور شہادت سے

(عمارہ شفیق، میرپور آزاد کشمیر)

......اور نجات مل گئی

آمنہ بتول

کیا آپ جانتے ہیں کہ چوہا بلی کے آتے ہی کیوں بھاگ جاتا ہے......؟؟؟ بلی کتنے ہی دبے پاؤں کیوں نہ آئے، چوہے کو اس کی آمد کی خبر ہو ہی جاتی ہے...... کیا آپ جانتے ہیں بلی کی گردن اندر کو کیوں دھنسی ہوئی ہوتی ہے؟؟ کیا کہا......؟ نہیں جانتے......؟؟ چلیں میں آپ کو بتاتی ہوں!!

آج سے کئی سو سال پہلے چوہوں کا ایک خاندان چھوٹے سے بل میں رہائش پذیر تھا۔ دن کی روشنی میں چوہے اپنے بل سے نہ نکل سکتے تھے اور نہ ہی خوراک تلاش کر سکتے تھے، سو سارا دن انہیں بھوکا رہنا پڑتا۔

وجہ یہ تھی کہ بلی نہایت آسانی سے انہیں دیکھ لیتی تھی اور شکار بنا لیتی تھی۔ سو چوہے جب رات کو بھی نکلتے تو بھی چھپ چھپا کر نکلتے۔ بلی کا خوف ان کے سر پر تلوار کی طرح لٹکتا رہتا۔ لیکن وہ کتنی ہی احتیاط کیوں نہ برتتے، بلی ایسے دبے پاؤں آتی کہ انہیں خبر تک نہ ہوتی اور ان کا ایک ساتھی بلی کے لنچ یا ڈنر کی نذر ہو جاتا۔

ایک لمبے عرصے تک وہ خوف کے عالم میں جیتے رہے، ہر روز ان کے ساتھی بلی کی بھینٹ چڑھتے رہے۔ آخر ایک رات بوڑھے چوہے نے اجلاس بلوایا، جس میں چوہا خاندان کا ہر چھوٹا بڑا چوہا شریک ہوا۔ اجلاس شروع ہوا تو بوڑھے چوہے نے آنکھوں میں آنسو بھرتے ہوئے کہا۔ ''میرے ساتھیو! یہ ڈر ڈر کر جینا بھی کوئی جینا ہے؟ یہ کیسی زندگی ہے کہ ہماری آنکھوں کے سامنے ہمارے پیارے دشمن کے پیٹ کا ایندھن بنتے رہیں اور ہم چپ چاپ سہتے جائیں؟؟'' بوڑھے چوہے کی آواز بلند ہوتی گئی۔

اس نے چاروں طرف نظر دوڑائی۔ دیگر چوہوں کی آنکھوں میں آنسو دیکھ کر اس نے مکا ہوا میں لہرایا اور کہا۔ ''آخر کوئی حد ہوتی ہے ظلم سہنے کی بھی۔ سوچو، میرے ساتھیو، سوچو، کوئی ترکیب سوچو اس عذاب سے نجات پانے کی، آزاد زندگی گزارنے کی......!'' بوڑھا چوہا خاموش ہوا تو سب سر جوڑ کر بیٹھ گئے۔ آخر ایک چوہا زور سے اچھلا اور بولا۔ ''وہ مارا......!!! ایسی ترکیب سوچی ہے کہ بس......'' سارے چوہے یک زبان ہو کر بولے۔ ''وہ کیا؟''

چوہا کھنکارا، دوبارہ کھنکارا، پھر کھنکارا، پھر اپنی گردن سہلاتے ہوئے گویا ہوا۔ ''ہم ایک گھنٹی بلی کی گردن میں باندھ دیں گے، تو جب وہ آئے گی تو گھنٹی بجے گی اور ہمیں پتا چل جایا کرے گا اور بھاگ جائیں گے!''

سب چوہے خوشی سے تالیاں پیٹنے لگے۔ ''واہ بھئی واہ! کیا عمدہ ترکیب ہے!! آپ بڑے ہیں، آپ ہی بلی کی گردن میں گھنٹی باندھیے۔''

چوہا تیار ہو گیا۔ جب بلی کے آنے کا وقت ہوا تو گھنٹی لے کر بل کے باہر کھڑا ہو گیا۔ باقی چوہے بل کے اندر سے جھانک رہے تھے۔ جوں ہی بلی قریب آئی، چوہے کے تو چھکے چھوٹ گئے...... پاؤں کپکپائے، ہاتھ تھرتھرائے، گھنٹی ہاتھ سے چھوٹ، پھولی سانسوں دوڑتا بل میں داخل ہو گیا۔ بلی تو شکار کو بچتا دیکھ کر واپس ہو لی، مگر چوہے بہادر کا بُرا حال ہوا۔

سب چوہے اس کے اردگرد کھڑے ہو کر قہقہے لگا رہے تھے۔ کوئی تالیاں پیٹ رہا تھا، کوئی سیٹیاں بجا رہا تھا، ایک نے تو یہ بھی کہہ دیا۔ ”بڑا آیا گھنٹی باندھنے والا، ہونہہ...... ڈرپوک!“ چوہا بے چارہ سر جھکائے ایک کونے میں بیٹھ گیا۔ اس کے ہاتھ پاؤں ابھی تک کانپ رہے تھے۔

اگلی رات تمام چوہے پھر سر جوڑ کر بیٹھ گئے۔ اس بار ایک بوڑھے چوہے نے ترکیب بتائی۔ ”میرے دوستو، اتفاق میں برکت ہے ناں، اس لیے جیسے ہی بلی آئے گی، ہم سب اس پر اکٹھے حملہ کر دیں گے، اپنے سارے مُردوں کے بدلے چکائیں گے، خوب خوب ماریں گے، ایسا کرنے سے بلی پر ہماری دھاک بیٹھ جائے گی اور دوبارہ ہمیں شکار کرنے کی جرأت نہ کر سکے گی۔“

سارے چوہے خوش ہو گئے اور بلی کا انتظار کرنے لگے۔ جوں ہی بلی آئی، سب نے یک بارگی حملہ کر دیا۔ کوئی ٹانگ سے چمٹ کر کاٹنے لگا، کوئی دُم سے، کوئی پیٹھ سے...... بلی نے جو زور لگایا، دم جھاڑی، پیر جو پٹخا تو ایک چوہا دور جا گرا، دوسرے کا کچومر نکل گیا۔ باقی چوہوں نے جو حال دیکھا تو بھگدڑ مچ گئی، سب بل کی طرف بھاگے۔ بلی نے اطمینان سے ایک تگڑا چوہا دبوچا اور چلتی بنی۔

سب چوہے ایک دوسرے کو لعن طعن کرتے، بزدل اور ڈرپوک کے القابات سے نوازتے پھر سر جوڑ کر بیٹھ گئے۔ سوچنے لگے اور سوچتے ہی چلے گئے یہاں تک کہ ایک ننھا سا چوہا بول اٹھا۔ ”مجھے ایک بڑھیا ترکیب سوجھی ہے، وہ یہ کہ زمین پر گوند پھیلا دی جائے، اور اس میں گوشت کا ایک ٹکڑا رکھ دیا جائے۔ بلی جب گوشت کا ٹکڑا لینے آئے گی تو اس کے پاؤں گوند کی وجہ سے چپک جائیں گے، پھر وہ ہلنے جلنے سے قاصر ہو جائے گی، اور یوں ہم گھنٹی اس کی گردن میں باندھ دیں گے۔“

اب چوہے خوشی خوشی گوند زمین پر پھیلائے، گھنٹی ہاتھ میں پکڑے بلی کا انتظار کرنے لگے۔ بلی آئی، سرخ گوشت کا بڑا سا ٹکڑا دیکھ کر اس کی باچھیں کانوں تک چر گئیں، جھٹ سے اس پر لپکی لیکن یہ کیا......؟؟

اس کے پاؤں تو گوند کی دلدل میں دھنستے پھسلتے چلے گئے۔ جیسے جیسے نکلنے کی کوشش کرتی، ویسے ویسے اس کا جسم مزید گوند میں لتھڑتا جاتا۔ چوہوں نے جو یہ ماجرا دیکھا تو نعرۂ مستانہ بلند کیا۔ ننھا چوہا لپک کر بلی کی پیٹھ پر چڑھ گیا اور اس کی گردن میں گھنٹی باندھ دی۔ دیر تک چوہے ننھے چوہے کے حق میں نعرے لگاتے رہے اور نجات کا جشن مناتے رہے اور بلی کا مذاق اڑاتے رہے...... اور اسی وقت سے چوہے بلی سے نہیں ڈرتے۔ انہیں بلی کے آنے کا دور سے پتا چل جاتا ہے کیوں کہ اس کی گردن میں بندھی گھنٹی بجتی رہتی ہے اور وہ فوراً ہی اپنے بل میں چھپ جاتے ہیں۔

اب آپ پوچھیں گے کہ گھنٹی کہاں ہوتی ہے؟ نظر تو نہیں آتی۔ تو جناب آپ بلی کی گردن کو ہاتھ لگائیں، آپ کو وہ اندر کی طرف دھنسی ہوئی محسوس ہو گی۔ یہ اسی پٹے کی علامت ہے جس کے ذریعے سے گھنٹی بلی کے آباء و اجداد میں سے ایک کی گردن میں باندھی گئی تھی۔ ☆☆☆

ا	ب	ت	ج	ل	و	م	ڑ	ی	ن
ص	ی	غ	ک	ب	ل	ر	ص	ض	ک
س	ل	ف	ش	ک	ے	س	ا	ن	پ
ش	ب	ق	و	ر	ج	خ	ژ	ز	ا
ط	غ	ء	گ	ی	ط	ف	ک	ت	ا
ش	ی	ر	ر	ص	ک	گ	و	ی	ء
چ	ڈ	ظ	خ	ض	ٹ	ت	ث	ا	م
ص	ت	ٹ	ا	و	ن	ٹ	م	ت	ن
ا	ی	ے	ن	ط	ظ	ک	ق	ی	گ
ع	م	ک	م	ر	غ	ی	ض	چ	ل

آپ نے حروف ملا کر دس جانوروں کے نام تلاش کرنے ہیں۔ آپ ان ناموں کو دائیں سے بائیں، بائیں سے دائیں، اُوپر سے نیچے اور نیچے سے اُوپر تلاش کر سکتے ہیں۔ آپ کے پاس وقت دس منٹ کا ہے۔ جن الفاظ کو آپ نے تلاش کرنا ہے وہ یہ ہیں:

بکری، اونٹ، کتا، بلی، مرغی، شیر، چیتا، لومڑی، خرگوش، سانپ

کھوج لگائیے!

ذہانت آزمائیں اور 500 روپے کی کتابوں کا انعام پائیں۔

پیارے بچو! آپ جانتے ہیں کہ بندر ایک بہت شریر جانور ہے۔ نقالی بھی خوب کرتا ہے۔ گلہری بھی ایک خوب صورت جانور ہے۔ لمبی سی دم جسم پر سیاہ دھاریاں قدرت کی کرشمہ سازی ہے۔ چڑیا بھی ایک ننھا سا پرندہ ہے۔ بہت معصوم سا۔

یہ تینوں ایک ناریل کے باغ میں ہیں۔ یہ ناریل کے درختوں پر چھلانگیں لگا رہے ہیں۔ خوب مزے میں ہیں۔ ان کا مقابلہ خوب زوروں پر ہے۔ آپ بتائیے کہ بندر، گلہری اور چڑیا میں سب سے پہلے کون کیلے حاصل کرے گا؟؟؟ کیوں ہے ناں مزے کی بات۔

ستمبر کے کھوج لگائیے کا جواب یہ ہے: میجر عزیز بھٹی

اس ماہ بے شمار ساتھیوں کے درست حل موصول ہوئے۔ ان میں سے پانچ ساتھیوں کو بذریعہ قرعہ اندازی انعامات دیئے جا رہے ہیں۔

1- سلمٰی لیاقت علی، میرپور آزاد کشمیر	2- علی حمزہ رجب قادری، کاموںکی
3- محمد ہمایوں انوار، جھنگ صدر	4- تابعہ احسان شیخ، ملتان
5- ہارون یوسف، لاہور	

روشنی نظر میں ہے

نیر شفقت

"بیٹا کچھ تو پڑھ لو۔ امتحان سر پر ہیں۔"

"پڑھ لوں گا امی! ابھی تو امتحانوں میں بہت دیر ہے۔" ارحم نے ڈور باندھتے ہوئے کہا۔

"بہت دیر کہاں بیٹا۔ اگلے ماہ تو ہو رہے ہیں امتحان۔ ارقم کو بھی تو دیکھو، ہر وقت پڑھتا رہتا ہے۔"

"رہنے دیں امی۔ بھائی تو ویسے بھی کتابی کیڑا ہے۔" ارحم نے ڈور کا تناؤ دیکھتے ہوئے کہا۔

"اور تم نے کپڑے بھی نہیں بدلے۔ کتنے میلے ہو رہے ہیں۔"

"بدل لوں گا امی۔ پہلے پتنگ تو اڑا لوں۔" ارحم نے پتنگ اور ڈور اٹھائی اور سیڑھیوں کی طرف بڑھ گیا اور امی ٹھنڈی سانس بھرنے کے سوا کچھ نہ کر سکیں۔ ارقم اور ارحم ان کے دو ہی بیٹے تھے۔ ان کے والد ایک سیٹھ کے ہاں ڈرائیور تھے۔ صبح سے نکلے ہوئے رات گئے آتے تھے۔ خود تو وہ زیادہ پڑھے لکھے نہ تھے لیکن چاہتے تھے کہ ان کے بچے پڑھ لکھ کر معاشرے میں باعزت مقام حاصل کر لیں۔ ارقم تو ان کی امیدوں پر پورا اتر رہا تھا۔ وہ آٹھویں میں پڑھتا تھا اور ہر سال اپنی جماعت میں اول یا دوم آیا کرتا تھا۔ اس سال وہ وظیفے کا امتحان دے رہا تھا اور قوی امید تھی کہ وہ اس میں کام یاب ہو جائے گا۔ ارحم چھٹی میں پڑھ رہا تھا۔ تھا تو وہ بھی ذہین لیکن نہ جانے کیا بات تھی کہ پڑھائی میں اس کا دل نہیں لگتا تھا۔ آسمان پر اڑتی رنگ برنگی پتنگیں جیسے اسے اپنی طرف بلاتی تھیں۔ یا پھر وہ گلی میں لڑکوں کے ساتھ کھیل کر خوش ہوتا تھا۔ امتحان آتے تو وہ مارے باندھے پڑھ کر پاس ہو جاتا۔ دوسری سب سے بڑی خامی اس میں یہ تھی کہ وہ گندا سندا رہتا تھا۔ کھیل کود کر آتا تو ماں چیختی رہتیں کہ نہا کر کپڑے ہی بدل لو مگر وہ سنی ان سنی کر کے ہاتھ منہ دھوئے بغیر کھانا کھا کر بستر پر جا گرتا۔ امی نے تو دو تین یونی فارم بنا رکھے تھے اس کے جنہیں وہ روزانہ ہی مل مل کر دھوتی تھیں کہ اسکول میں کبھی رگڑ سے مٹی کے داغ لگے ہوتے تھے اور کبھی سیاہی کے۔ اسکول سے گھر آ کر وہ بمشکل ہی یونی فارم تبدیل کرتا تھا۔

اب بھی امتحان سر پر کھڑے تھے لیکن اسے کھیل کود سے ہی فرصت نہیں ملتی تھی کہ کچھ پڑھ لے۔ امی اور ارقم اسے سمجھا سمجھا کر عاجز آ چکے تھے اور تو اور ایک دن ابو نے بھی اس کی ٹھیک ٹھاک پٹائی لگائی مگر وہی ڈھاک کے تین پات۔ مار کے اثر سے کچھ دن تو پڑھائی بھی ہوئی اور صفائی ستھرائی بھی مگر جیسے ہی مار کا درد ختم ہوا،

اس کی پھر وہی پرانی روٹین شروع ہوگئی۔

سالانہ امتحانات میں دس دن رہ گئے تھے۔ جب وہ حادثہ پیش آیا۔ پتنگ کے پیچھے بھاگتے ہوئے دیوار پر سے اس کا پیر پھسلا اور وہ دھڑام سے نیچے پتھروں پر آ گرا۔ اسے اسپتال لے جایا گیا۔ وہاں جا کر پتا چلا کہ پیر کی ہڈی ٹوٹ گئی ہے۔ لہٰذا پاؤں پر پلاسٹر چڑھا دیا گیا۔ اس کے ساتھ اس کا ماتھا بھی پھٹ گیا تھا وہاں چھ ٹانکے لگے۔ مرہم پٹی اور ضروری ٹریٹمنٹ کے بعد اسے جنرل وارڈ میں منتقل کر دیا گیا۔ اسپتال میں امی اور ارقم اس کے پاس تھے۔ ابو اپنی ڈیوٹی کی مجبوری کی وجہ سے تھوڑی دیر کے لیے آتے اور حال چال پوچھ کر چلے جاتے۔ ارقم اپنی کتابیں یہیں لے آیا تھا کہ فارغ بیٹھنے سے بہتر ہے امتحان کی تیاری کر لے۔ ویسے بھی وہ وظیفے کا امتحان دے رہا تھا سو اسے دوگنی محنت کرنا تھی۔

ارحم ایک ہی دن میں بور ہوگیا۔

’’گھر چلیں امی۔‘‘ اس نے رٹ لگا دی۔ امی کیا کرتیں ڈاکٹر چھٹی دیتے تو وہ اسے گھر لے جاتیں۔ ڈاکٹر نے اسے احتیاط داخل کیا تھا۔

سرکاری اسپتالوں میں صفائی کی جو حالت ہوتی ہے وہ کسی سے ڈھکی چھپی نہیں ہے۔ خاکروب ایک مرتبہ ڈیٹول کا پونچھا لگا جائے تو باقی سارا دن مکھیاں بھنبھناتی رہتیں۔ پھر دواؤں کی رنگ برنگی خوشبوئیں۔ کسی مریض نے قے کر دی تو اس کی بدبو الگ۔

’’اف امی! کس قدر گندگی ہے یہاں اور بدبو بھی۔‘‘ ساتھ والے بستر کے مریض نے جو کہ تین سال کا بچہ تھا اور اسہال کا مریض تھا۔ اس نے پاخانہ کر دیا تو ارحم نے ناک پکڑتے ہوئے مڑ کر امی کو دیکھتے ہوئے کہا۔

’’اسپتالوں میں تو ایسا ہی ہوتا ہے بیٹا۔‘‘ امی کون سا امیر گھر کی تھیں جو انہوں نے پرائیویٹ وارڈ یا اسپتال اور ان کی صفائی دیکھی ہوتی۔

’’نہیں امی۔‘‘ ارحم نے ماں کی بات سے اختلاف کرتے ہوئے کہا۔ ’’ہم نے اپنی کتاب میں پڑھا ہے کہ اسپتالوں میں صفائی کا خاص خیال رکھا جاتا ہے مگر...... یہاں تو...... اچھا بھلا انسان بھی یہ ماحول دیکھ کر بیمار ہو جائے گا۔‘‘ وہ ایک لمحہ کے لیے رکا پھر بولا۔ ’’اور بیماریاں تو ویسے بھی گندگی سے پھیلتی ہیں۔‘‘

ارقم کو شوخی سوجھی۔ ’’مگر ارحم تم تو خود بھی گندے سندے رہتے ہو۔ مٹی میں کھیلتے ہو پھر کئی کئی دن نہاتے بھی نہیں ہو، تمہیں کیا فرق پڑتا ہے۔ اس نے مسکراتے ہوئے کہا۔

اب ارحم کی آنکھیں کھلیں۔ ’’واقعی‘‘ اس نے دل میں سوچا۔ ’’بھائی کہہ تو ٹھیک رہا ہے۔ مجھے کوئی فرق نہیں پڑنا چاہیے۔ میں تو رہتا ہی گندہ سندہ ہوں۔ نہ جلدی کپڑے بدلتا ہوں۔ نہ کھانا کھانے سے پہلے اور بعد میں ہاتھ دھوتا ہوں۔‘‘ وہ گم سم سا سوچے جا رہا تھا۔

’’مگر گندگی تو گندگی ہوتی ہے نا اور میں جو امی سے کہہ رہا ہوں کہ گندگی دیکھ کر تو صحت مند انسان بھی بیمار ہو جائے گا اور میں تو خود صفائی کا خیال نہیں رکھتا ہوں سب سے پہلے تو میں خود ہی بیمار ہو جاؤں گا ناں۔

اور صفائی تو ہمارے اللہ تعالیٰ کو اور ہمارے پیارے نبی کو بھی

بہت پسند ہے۔ صاف ستھرے لوگوں کو تو سبھی پسند ہیں اور مجھے......؟؟؟‘‘ اس سے آگے اس کی سوچوں کے جواب دے دیا۔ اس نے پلٹ کر بھائی کو دیکھا تو وہ اس کے خیالات سے بے خبر اپنی پڑھائی میں گم تھا۔ امی بھی بیڈ کے ایک کونے میں بیٹھی اونگھ رہی تھی۔ سالانہ امتحانوں میں آٹھ دن رہ گئے تھے اور بھائی جی جان سے تیاری کر رہا تھا امتحانوں کی۔

’’میں اسپتال کے اس بیڈ پر لیٹا کیا کر رہا ہوں۔‘‘ اس نے سوچا۔ ’’اسکول تو میں جا نہیں سکتا۔ یہاں اسپتال میں یا پھر گھر جا کر آرام ہی کرنا ہے نا تو کیوں نہ امتحان کی تیاری کر لی جائے۔ بھائی سے کہوں گا کہ وہ مجھے سائیکل پر بیٹھا کر امتحان دینے کے لیے لے جایا کرے۔‘‘ فیصلہ کر کے اس نے بیڈ سے ٹیک لگا کر سکون سے آنکھیں موند لیں۔

آج 31 مارچ کا دن تھا۔ اسکول کا سالانہ رزلٹ کا اعلان ہو رہا تھا۔ سبھی بچوں کے دل دھڑک رہے تھے۔ کوئی پوزیشن لینے کے لیے بے چین تھا تو کسی کو فیل ہو جانے کا ڈر تھا۔ جماعت ششم کی باری آئی تو ارحم کے دل کی دھڑکن تیز ہو گئی۔ اپنی طرف سے تو اس نے بہت اچھی تیاری کی تھی پھر بھائی نے بھی اس کی بہت مدد کی تھی پھر بھی اسے ڈر تھا کہ کہیں فیل نہ ہو جائے۔

’’ششم بی میں تیسری پوزیشن جاتی ہے ارحم احمد کو۔‘‘ پرنسپل صاحب نے اعلان کیا تو وہ حیرت سے گنگ رہ گیا۔ پاس تو شاید وہ ہو ہی جاتا مگر تیسری پوزیشن...... ناممکن سی بات تھی۔

’’میں شاباش دوں گا اس بچے کو کہ زخمی ہونے کے باوجود اس نے دل لگا کر پڑھا اور ٹانگ پر پلاسٹر ہونے کے باوجود اس حالت میں آ کر امتحان بھی دیا۔ ارحم احمد کے لیے خصوصی تالیاں۔‘‘

اور ارحم نے نم ہوتی آنکھوں سے دیکھا کہ تمام اساتذہ بھی اس کو خراج تحسین پیش کرنے کے لیے کھڑے ہو کر تالیاں بجا رہے ہیں۔ وہ اپنا انعام لینے کے لیے لنگڑاتا ہوا اسٹیج کی طرف بڑھ گیا......

☆☆☆

(بقیہ: لیاقت علی خان سال بہ سال)

☆ 1950ء (2 مئی) لیاقت علی خان کی امریکہ روانگی اور دورۂ امریکہ کیا۔

☆ 1950ء (8 مئی) کولمبیا یونی ورسٹی (امریکہ) نے ڈاکٹر آف لاز کی ڈگری دی۔

☆ 1950ء (13 مئی) کنساس یونی ورسٹی (امریکہ) نے بھی ڈاکٹر آف لاز کی ڈگری پیش کی۔ اس دورے کے اختتام پر وہ کینیڈا کے دارالحکومت اوٹاوہ بھی گئے۔

☆ 1950ء (9 اکتوبر) لیاقت علی خان کو آل پاکستان مسلم لیگ کا صدر منتخب کیا گیا۔

☆ 1950ء (30 اکتوبر) لیاقت علی خان نے پشاور یونی ورسٹی کا افتتاح کیا۔

☆ 1951ء (27 جولائی) کراچی میں لیاقت علی خان نے مُکا لہراتے ہوئے فرمایا تھا: ’’یہ پانچ انگلیاں جب تک الگ الگ ہوں تو ان کی قوت کم ہو جاتی ہے اور جب یہ مل کر مُکا بن جائے تو دشمن کا منہ توڑ سکتا ہے۔‘‘

☆ 1951ء (14 اگست) قوم کے نام یوم آزادی کا پیغام دیتے ہوئے انہوں نے فرمایا: ’’میرے پاس کوئی مال و متاع نہیں جو پاکستان پر قربان کر سکوں۔ ایک جان ہے سو وہ پاکستان پر قربان کرنے کے لیے ہر وقت تیار ہوں۔ اگر پاکستان کی بقا کے لیے خون بہانا پڑا تو میں آپ کو یقین دلاتا ہوں کہ لیاقت کا خون سب سے پہلے بہے گا۔‘‘

☆ 1951ء (16 اکتوبر) بہ مطابق 13 محرم الحرام 1371 ہجری، راول پنڈی کے کمپنی باغ (اس کا اب نام لیاقت باغ ہے) میں ابھی اپنا خطاب شروع ہی کیا تھا کہ گولیاں چلیں اور آپ گر پڑے۔ اپنے سیکریٹری نواب صدیق علی خان کے زانوں پر سر رکھے پہلے کلمہ پڑھا اور پھر کہا: ’’خدا پاکستان کی حفاظت کرے۔‘‘ اس کے ساتھ ہی ان کی گردن ڈھلک گئی۔

☆ 1951ء (17 اکتوبر) کراچی میں قائداعظم محمد علی جناح کے پہلو میں تدفین ہوئی۔ وہ پہلے پاکستانی تھے جو مزار قائد کے پہلو میں دفن ہوئے۔ قوم نے انہیں ’’شہید ملت‘‘ کا خطاب دیا۔

☆☆☆

وہ کچھ دیر پہلے ہی اس بستی میں داخل ہوا تھا۔ اس نے دیکھا کہ سڑک کے کنارے کچے کی زمین پر ایک غریب آدمی کھڑا اپنے زخمی گدھے کی مرہم پٹی کررہا ہے۔ وہ اس دیہاتی کے پاس جاکر اس سے کہنے لگا۔

''بھائی! ویسے تو میں یہاں مسافر ہوں۔ صبح سے کچھ کھایا نہیں، پیاس بھی شدید لگی ہے لیکن تمہیں پریشانی میں دیکھ کر مجھ سے رہا نہیں گیا۔''

دیہاتی گدھے کو چھوڑ کر اس کی طرف متوجہ ہوگیا۔ وہ اس کی بات کو غور سے سننے لگا۔

''ہوا کیا تھا؟'' وہ گدھے کے زخم کی طرف دیکھتا ہوا بولا۔

''میں سامان لاد کر آرہا تھا کہ ایک آدمی لہراتا ہوا گاڑی لا رہا تھا۔ میں نے ادھر اُدھر ہونے کی بہت کوشش کی۔'' اور یوں اس نے اپنا قصہ بیان کردیا

''میں طبی امداد کے حوالے سے کچھ جانتا ہوں، اگر تم مجھے پانی پلا سکو تو میں پھر......'' دیہاتی اس کی بات کا مفہوم سمجھ گیا اور فوری بولا۔

''اگر آپ میرے گدھے کا خیال رکھیں تو میں قریبی کنویں سے پانی لے آؤں۔''

''ہاں ہاں! کیوں نہیں۔'' اس نے خوش دلی سے کہا اور گدھے پر ہاتھ پھیر کر اس کے زخم کو دیکھنے لگا۔ اس شخص نے اپنے گدھے پر لدے سامان سے ایک برتن نکالا اور اسے لے کر کچے میں نیچے کی جانب چل دیا۔

مسافر نے اپنے کاندھے سے تھیلا اتارا اور اس کو کھولنے لگا۔ اس میں اس کے پاس کوئی ٹیوب تھی۔ اس نے گدھے کے زخم کو خوب اچھی طرح صاف کیا اور بڑی محبت سے اس پر ٹیوب لگانے لگا۔ کچھ دیر میں دیہاتی اپنے برتن میں پانی لے آیا۔ کنویں کا پانی بے حد صاف، ٹھنڈا اور میٹھا تھا۔ پانی پی کر اس کی جان میں جان آگئی۔ پانی پی کر وہ پھر سے مرہم پٹی میں لگ گیا۔ دیہاتی بے حد مسرور تھا کہ اس نے اس کی مدد کی۔

''بھائی! تم یہاں کس کے پاس آئے ہو۔'' مرہم پٹی کے بعد وہ مسافر کو اپنے گھر لے آیا۔

''بات اصل میں یہ ہے کہ ہمارے گاؤں میں آج کل کوئی کام کاج نہیں ہے۔ میں اپنی بوڑھی ماں اور بہن کے ساتھ رہتا ہوں۔ کھانے کے لالے پڑنے لگے تو میں روزی کی تلاش میں نکلا ہوں۔''

مسافر کی پریشانی سن کر دیہاتی کا دل بھر آیا۔ وہ سوچ میں پڑ گیا کہ اپنے اس بھائی کی کس طرح مدد کرے۔

''تم کیا کیا کر سکتے ہو؟''

''ویسے تو میں محنت مزدوری کا ہر کام کر سکتا ہوں لیکن پیشے کے اعتبار سے درزی ہوں۔ کپڑے اچھے سیتا ہوں۔''

اس کی اس بات پر وہ کوئی ترکیب سوچنے لگا جس سے وہ اسے اپنے گاؤں میں ہی ٹھیرا لے۔ اس کو یہ شخص بے حد پسند آیا تھا۔ وہ چاہتا تھا کہ اسے اپنا دوست بنا لے۔ تھوڑی دیر بعد جب کھانا تیار ہوگیا تو وہ دیہاتی جس کا نام مونو تھا، کھانا لے کر آگیا۔ کھانا کھانے کے بعد وہ مجید سے بولا۔

''بھائی مجید! میرے گھر کے باہر والے حصے میں جو بیٹھک ہے، وہ میرے کسی کام نہیں آتی، اگر تم چاہو تو اس میں اپنی دکان کر سکتے ہو۔''

مجید نے وہ بیٹھک دیکھنے کا ارادہ ظاہر کیا۔ وہ دونوں بیٹھک میں گئے۔ اس کے بعد اس نے باہر کے دروازے اور سڑک کا جائزہ لیا۔ آس پاس کے مکانات کو بہ غور دیکھنے کے بعد اس نے اندازہ لگایا کہ یہاں اس کا کام جم سکتا ہے۔

اس نے گردن ہاں میں ہلائی تو مونو کو ایسے خوشی ہوئی جیسے وہ خود کوئی کاروبار شروع کر رہا ہو۔ مجید نے اجازت چاہی تو اس نے اسے جانے نہیں دیا۔ شام تک اس نے اس کی خوب آؤ بھگت کی۔ مجید نے اس سے کرایے اور دیگر معاملات کی تفصیل معلوم کی لیکن مونو انتہائی سیدھا انسان تھا۔

''یہ جگہ ویسے ہی فالتو دھری ہے۔ تمہارے کام آئے گی تو مجھے خوشی ہوگی، مگر کرایے کا بول کر مجھے گناہ گار نہ کرو۔''

مجید نے ضد کی لیکن وہ نہ مانا۔ وہ دل ہی دل میں اس کے لیے نیک خواہشات لے کر اٹھا اور دو تین روز میں آنے کا کہہ کر رخصت ہولیا۔ اپنے گاؤں پہنچ کر اس نے اپنی ماں کو بتایا کہ اسے ساتھ والے گاؤں میں کام کا آسرا مل گیا ہے اس لیے وہ وہاں جانا چاہتا ہے۔ ماں کی ہاں کے بعد اس نے سلائی مشین اور دیگر سامان اکٹھا کرنا شروع کر دیا۔ اگلے دن وہ بکرم، بٹن اور دھاگے سوئیاں لینے شہر نکل گیا تا کہ اسے بار بار پریشانی نہ ہو۔ تین دن بعد وہ مونو کے گھر ایک گاڑی پر سارا سامان رکھے پہنچ گیا۔ مونو تو جیسے اس کی آس لگائے بیٹھا تھا۔ اس نے اسے ہاتھوں ہاتھ لیا۔ سارا سامان اٹھایا، خود رکھوایا۔ اس کی دکان کی سیٹنگ کرائی اور اس کے کھانے پینے کا انتظام بھی کیا۔

مونو نے اپنے گاؤں میں مجید کی ایسی شہرت کردی اور اللہ کا کرنا ایسا ہوا کہ لوگ ایک ایک کرکے اس کے پاس کپڑے سلوانے کے لیے آنے لگے۔ شرفو اس بستی میں اکیلا درزی حکم رانی کر رہا تھا، اب اس کا کام ماند پڑ گیا اور مجید کی نیک نیتی اور خوش اخلاقی سے کچھ ہی دنوں میں اس کا کام جم گیا۔ یہاں رہتے ہوئے مونو نے اس کو کھانے میں بھی شریک کر لیا تھا۔ اس کی بیوی نے کچھ اونچ نیچ کی کوشش کی تھی لیکن اس نے یہ کہہ کر خاموش کر دیا تھا کہ اری نیک بخت! ہم دو کا پکتا ہے، دو روٹیاں اگر زیادہ بنالیں تو کیا فرق پڑے گا۔ عورت کو بہرحال اپنے شوہر کی ماننا ہی پڑتی ہے۔

مجید نے دو ماہ کرایہ دینے کی کوشش کی لیکن مونو نہ مانا۔ وہ پہلے تو شام میں اپنے گاؤں چلا جاتا تھا لیکن کام زیادہ ہوتا تو وہ اسی بیٹھک میں سو جاتا۔ شام کے وقت وہ دونوں کچے میں نہر کنارے جا کر بیٹھ جاتے اور گھنٹے دو گھنٹے جی بہلا کر آتے، پھر سو جاتے۔ مجید نے روٹی کا احسان لینا مناسب نہ سمجھا تو راشن کا سامان لانے لگا۔ کبھی آٹا تو کبھی دالیں اور کبھی گوشت۔ لیکن سامان لانے کے بعد یہ فرق آیا کہ وہ کچھ من مانی بھی کرنے لگا۔

''بھائی مونو! یہ چاول اور گوشت لایا ہوں، بھابھی کو بول کر بریانی بنوالو۔''

وہ بے چارا فوری اس کے حکم کی تعمیل کراتا۔ اسے ہر انداز سے خوش رکھنا اس کی دلی خواہش تھی۔

اس کی بیوی مسکین سی تھی، نئے کپڑے بنوانے کی خواہش مند نہ تھی لیکن مجید بھائی کے اصرار اور تیوہار کی آمد پر اس نے دو تین جوڑے کپڑے کے منگوا لیے۔ مجید نے سی دیے لیکن مونو کو پہلا جھٹکا اس وقت لگا جب اس نے سلائی کی رقم کا اخلاقاً سوال کیا تو اس نے بغیر کوئی لحاظ رکھے بغیر کہہ دیا کہ ہوتے تو تین جوڑوں کے نو سو روپے ہیں لیکن آپ آٹھ سو دے دو۔ مونو نے وہ رقم دینے میں دیر نہ کی لیکن دل میں ایک پھانس سی چبھ گئی۔ وہ تو چھے ماہ سے اس کی خدمت کر رہا تھا، نہ کرایہ نہ کوئی بل نہ کھانے پینے کا حساب۔ وہ چپ سا ہوگیا اور اس نے بہرحال احساس نہیں ہونے دیا۔

اچھے دن ہمیشہ نہیں رہتے۔ اس کی روزی کا ذریعہ اس کا گدھا تھا جس پر لوگوں کا سامان چھوڑ آتا تھا اور اس سے ملنے والی رقم سے

گزارا کرتا تھا۔ وہ ان دو میاں بیوی کے لیے بہت ہوتا تھا۔اس کا گدھا عمر رسیدہ ہوچلا تھا۔اب کے بیمار ہوا تو ایسا کہ وہ اٹھ نہ سکا۔ اس کی موت نے اسے کم زور کردیا۔ وہ گھر میں جمع پونجی تو رکھتا نہ تھا کہ کچھ اور کر سکتا۔ کھانے کے لالے پڑنے لگے تو ایسے میں مجید نے سہارا دیا۔

''تم فکر نہ کرو، میں ہوں ناں!'' اس کے اس جملے نے اس کو حوصلہ دیا۔

مجید نے گھر کا سارا سامان لانا شروع کردیا۔اصولی طور پر وہ کوئی احسان نہیں کر رہا تھا کہ وہ وہیں رہ رہا تھا اور سب کچھ کھا پی بھی رہا تھا۔ فرق صرف اتنا تھا کہ پہلے مونو سارا خرچ چلاتا تھا، اب یہ ذمے داری اس نے سنبھال لی۔ اب ہوا یوں کہ راشن لانے کے بعد سے اس نے آنکھیں بھی گھمانا شروع کر دیں، نخرے بھی کرنے لگا اور فرمائشی کھانے بنوانے لگا۔ اس کے لہجے میں احسان داری بھی آ گئی تھی، مونو مصلحتاً خاموش تھا۔ ابھی کچھ بولنا اپنے پاؤں پر کلہاڑی مارنا تھا۔

پندرہ دن تک گھر بیٹھے بیٹھے وہ تنگ آ گیا۔ اسے اپنے کام اور روزی کی فکر ہوئی، اور پھر وہ کب تک یوں بے حیائی سے کسی اور کا دیا کھاتے، اس نے تو ہمیشہ لوگوں کی مہمان داری کی تھی، اب بھلا کیسے گوارا ہوتا۔ اس نے نئے گدھے کی خریداری کے لیے جتن شروع کردیے۔ وہ بہت گھوما پھرا لیکن اسے کوئی صورت نظر نہیں آئی۔ اچھا جانور ایک لاکھ سے شروع ہوکر کوئی دو ڈھائی لاکھ تک کا تھا۔ اب وہ بھلا اس رقم کا انتظام کیسے کرتا۔ اس کی بیوی تو اس کو بہت سمجھاتی تھی کہ کچھ پیسا جوڑ بھی لو مگر وہ ہنس کر ٹال دیتا تھا۔ آج اسے علم ہوا کہ عورتوں کی بات مان لینے میں بھی کچھ نہ کچھ حکمت ہوتی ہے۔

وہ تین چار دن اداس اداس سا پھرا تو مجید نے اس سے پوچھ ہی لیا۔

''کیا بات ہے بھائی؟''

اس نے اپنا مقصد بتایا تو وہ بولا۔

''ارے تو میں کر تو رہا ہوں۔ اب تم کیوں پریشان ہوتے ہو، تم چلاؤ گھر یا میں۔۔۔۔ بات تو ایک ہی ہے۔''

''نہیں بھائی! میں محنت کش ہوں، گھر میں نچلا بیٹھا نہیں جاتا۔''

''اچ..... چھا.....'' وہ کچھ دیر سوچ میں پڑ گیا۔ ''ٹھیک ہے، ایک لاکھ تک کا میں تمہارا انتظام کرا دوں گا۔''

''وہ کیسے.....'' خوشی اور حیرت کے ملے جلے جذبے سے اس نے سوال کیا۔

''بھائی! میری بڑی بی اس معاملے میں بہت تیز ہے، میں جو رقم دیتا ہوں، اس میں آدھی خرچ کرتی ہے، آدھی بچا لیتی ہے۔ میں اس سے بات کروں گا۔'' وہ اس کو سہانے خواب دکھانے لگا۔ اس کے چہرے پر اداسیوں کے سائے ختم ہونے لگے۔ امید کی نئی کرن نے اس کے چہرے کو روشن کر دیا۔

''یار! بھابھی کو بول کر آج کوفتے بنوا لے، بڑا دل کر رہا ہے۔''

''ہاں ہاں! کیوں نہیں۔'' وہ خوش دلی سے اٹھا اور اپنی بیوی کو ہدایات دینے لگا۔ اب اسے آسرا تھا کہ وہ پھر سے کام شروع کردے گا۔

دو تین دن بعد مجید اپنے گاؤں گیا تو ایک دن بعد اس کے لیے خوش خبری کے ساتھ واپس آیا۔

''تمہارے لیے تگڑی سفارش کر کے اماں کو منا لیا ہے۔''

''بہت اچھے.... مگر اب یہ رقم ملے گی کیسے....''

''تمہیں میرے گھر اماں کے پاس چلنا ہو گا، وہ رقم تمہیں وہیں دے دے گی۔''

''اور اس کی واپسی......''

''ارے اس کی کیوں فکر کرتا ہے۔ میں ہوں نا! آرام سے دے دینا۔''

''پھر بھی....'' ایک لاکھ کا قرض بڑا ہوتا ہے۔ اس کی فکر مونو جیسے انسان کو نہیں ہوتی تو کسے ہوتی۔

''تم امی کو پانچ ہزار مہینا دیتے رہنا اور بس.....''

''بس س س س....'' خوشی سے اس کی باچھیں کھل اُٹھیں۔ وہ دل ہی دل میں اپنے سچے دوست اور محسن کو دعائیں دینے لگا۔ اس کو خیال آیا کہ اس نے اسے اپنے گھر پناہ دے کر کس قدر درست فیصلہ کیا تھا۔ اس کی بیوی تو اسے اس طرح رکھنے پر راضی نہیں تھی لیکن آج جب اس نے اسے یہ بات بتائی کہ وہ ہمیں ایک لاکھ روپیہ اتنی نرم شرائط پر دلا رہا ہے تو اس نے بھی اور اچھے اچھے کھانے بنا کر اسے کھلانا شروع کر دیے۔

اب کی بار جب وہ اپنے گاؤں جانے لگا تو اس نے اسے ساتھ لے لیا۔ مجید کا کہنا تھا کہ میں دو ایک روز چھٹی کروں گا۔ اماں سے رقم مل گئی تو ساتھ چل کر دو تین گاؤں میں اچھا اور مناسب دام کا جانور لے کر آئیں گے۔ اس کے لیے اس سے زیادہ خوشی کی کیا بات ہوتی۔

وہ اس کے گھر گیا۔ اس کا استقبال بھی بہتر ہوا۔ اماں نے کھانا وانا کھلایا۔ اس کے بعد کام کی بات شروع ہوئی۔ اماں نے ساری بات سن کر اس سے کہا۔

''ارے بیٹا! میرے مجو نے تمہاری زوردار سفارش کی ہے۔ اس لیے اب انکار تو ممکن نہیں۔''

''میں آپ کا بہت شکر گزار رہوں گا۔''

وہ اب حسرت سے دیکھ رہا تھا کہ اماں کب رقم نکال کر اس کی ہتھیلی پر رکھتی ہے۔

''پر بیٹا! ایک بات ہے۔''

''وہ بھلا کیا؟''

''میں ادھار رقم دیتے وقت بڑی احتیاط کرتی ہوں، تمہیں ایک اسٹامپ پر دست خط کر کے دینا ہوں گے۔''

''یہ ثبوت کے لیے ہوتا ہے ورنہ بڑی مشکل ہو جاتی ہے۔'' مجید نے اسے سمجھایا۔

جب کسی معاہدے کے لیے تحریر لکھی جا رہی ہو تو بھلا مونو کو کیا اعتراض ہوتا۔ اس نے ہامی بھری تو اماں بی نے ایک چھپا ہوا کورٹ کا کاغذ نکالا اور اس کے آگے رکھ دیا۔ وہ کون سا پڑھا لکھا تھا جو دست خط کرتا۔ انہوں نے جہاں جہاں بتایا اس نے انگوٹھا لگا دیا۔ شناختی کارڈ کی کاپی لگا دی۔ رقم مل گئی تو وہ ہنسی خوشی رخصت ہوئے۔ دو گاؤں کی خواری کے بعد بالآخر انہیں نوّے ہزار میں اچھا جانور مل گیا اور وہ گھر لوٹ آئے۔

اس نے کام شروع کیا۔ جانور اچھا تھا اس لیے مزدوری بھی زیادہ کرنے لگا۔ گویا پانچ ہزار کی اضافی قسط کا بندوبست بھی اوپر والے نے ساتھ ہی کر دیا تھا۔ جیسے ہی پہلی تاریخ ہوئی اس نے رقم مجید کے حوالے کردی۔ اس نے اس کا شکریہ ادا کیا اور رقم اپنی ماں کو دے آیا۔ تین مہینے بڑے اچھے گزرنے۔ مجید کا کام بھی اچھا جا رہا تھا، ایسے میں اس کا جانور بیمار ہو گیا تو وہ ٹھیک ہونے میں نہیں آیا۔ حالات پھر خراب ہونے لگے تو قسط بھی مشکل ہو گئی۔ مجید نے اس کی ہمت بڑھائی اور اپنا مخصوص جملہ بولا۔

''بھائی! فکر نہ کرو، میں ہوں ناں۔''

کام پر ایک طرف توجہ کرنے کے لیے اس نے اپنی ماں اور بہن کو بھی وہیں بلا لیا تاکہ گھر ایک ہو جائے۔ ان دونوں نے ایک کمرا ان کے لیے خالی کر دیا۔ اب تو ان کے احسانوں کا بوجھ بھی اتارنا تھا۔ جانور بیماری کے بعد ایسا نڈھال ہو کہ کسی کام کا نہ رہا۔ اب وہ کیا کرتا، تین چار ماہ سے وہ پانچ ہزار بھی ادا نہ کر سکا تھا۔ وہ شرمندہ تھا لیکن ایک کام اور ہو گیا تھا کہ اس کی ماں کے آجانے کے بعد مونو کی بیوی کی حالت ان کی ملازمہ جیسی ہو گئی تھی۔ وہ ہر طرح سے ان کی جی حضوری کر رہی تھی۔ اب تو مونو کو بھی مجید اپنا سامان لانے کے لیے دوڑانے لگا تھا۔

چھے ماہ گزر گئے تو ایک روز مجید اور اس کی ماں نے ان دونوں کو سامنے بٹھایا اور کہا۔

''دیکھو! اصول کی بات یہ ہے کہ آپ نے مجھ سے قرض لیا۔ اس کی کچھ شرائط طے پائیں تھیں۔''

''جی جی....'' اس نے کہا۔

''اب چوں کہ معاہدے کے مطابق تم نہ تو مجھے منافع دینے کے لائق رہے ہو اور نہ ہی اصل رقم.....''

وہ ان کی باتیں سن کر پریشان سا ہو گیا۔

''اس اسٹامپ کی رو سے اب یہ مکان میرا ہے۔ میں اسے دوبارہ بنوانا چاہتی ہوں اس لیے تم اپنا بندوبست کہیں اور.....''

اس کے پیروں تلے زمین نکل گئی۔ اس نے کبھی ایسا سوچا بھی نہ تھا۔ اس نے مجید کی طرف حسرت بھری نظروں دیکھا۔ اس نے روکھا سا جواب دے کر منہ ایک طرف پھیر لیا۔ وہ بہت چیخا، چلایا، لوگوں سے ملا لیکن کوئی فائدہ نہیں ہوا اس لیے کہ وہ ایک لاکھ کے عوض اپنا مکان فروخت کر چکا تھا۔ اب اس کے پاس اپنا سامان باندھ کر وہاں سے نکلنے کے علاوہ کوئی چارا نہ تھا۔

☆☆☆

کر بھلا ہو بھلا

سویرا فلک

سعد ایک ہونہار طالب علم تھا۔ ہر سال اپنے اسکول میں پہلی پوزیشن حاصل کرتا تھا۔ اس کی ذہانت کے باعث گھر کے تمام لوگ اور اسکول کے تمام اساتذہ اس سے بہت محبت کرتے تھے۔ مگر اس کی ایک خامی اس کی تمام خوبیوں پر بھاری تھی۔ وہ یہ کہ جب کبھی کسی کو سعد کی مدد کی ضرورت پڑتی تو سعد اکثر اسے ٹال کر اپنی جان بچا کر بھاگ جاتا تھا۔ اس کی اس عادت سے سب لوگ سخت نالاں تھے۔ اس کے والدین اور اس کے اساتذہ اکثر اسے دوسروں کی مدد کرنے کی نصیحت کرتے تھے مگر وہ حسب عادت ان کی بات ایک کان سے سن کر دوسرے کان سے نکال دیتا تھا۔ وقت گزرتا رہا اور سعد آٹھویں جماعت میں پہنچ گیا۔ آٹھویں جماعت ہر طالب علم کے لیے اس کے مستقبل کے لحاظ سے اہم جماعت ہوتی ہے۔ سعد بھی اس سال اپنی پوزیشن برقرار رکھنے اور نویں جماعت میں اپنا پسندیدہ مضمون حاصل کرنے کے لیے ہمیشہ سے زیادہ محنت کر رہا تھا۔ اس نے اپنا ٹائم ٹیبل مزید سخت کر لیا تھا۔ اب وہ روز شام کو دو گھنٹے کے بجائے صرف ایک گھنٹہ کھیلتا تھا۔ آج اتوار کا دن تھا اور سعد صبح سے بیٹھا ریاضی کی مشق کر رہا تھا کہ دروازے پر دستک ہوئی۔ سعد نے چونک کر سر اٹھایا تو فراز بھائی دروازے پر موجود تھے۔ فراز بھائی، سعد کے تایا زاد کزن تھے۔ گو کہ وہ عمر میں اس سے بڑے تھے مگر پھر ان دونوں میں بہت اچھی دوستی تھی۔ وہ اکثر اتوار کے روز سعد سے ملنے آ جاتے تھے اور پھر دونوں مل کر کوئی نہ کوئی تفریح کر لیا کرتے تھے۔ آج بھی وہ اسی ارادے سے آئے تھے۔ جب وہ سعد کے کمرے میں داخل ہوئے تو انہوں نے سعد کو کتابوں میں غرق پایا۔ ان کے دستک دینے پر سعد نے سر اٹھا کر انہیں دیکھا اور پھر مسکراتا ہوا اٹھ کھڑا ہوا۔

''السلام علیکم فراز بھائی۔ کیسے ہیں آپ؟'' سعد نے انہیں سلام کیا اور خیریت دریافت کی تو فراز بھائی نے اس سے ہاتھ ملاتے ہوئے کہا۔ ''وعلیکم السلام سعد بھئی مجھے یہ دیکھ کر بہت خوشی ہو رہی ہے کہ تم اس بار ہمیشہ سے زیادہ محنت کر رہے ہو۔ میرے خیال میں اس بار تم پوزیشن لینے کے بجائے ٹاپ کرنے کا ارادہ رکھتے ہو۔'' فراز بھائی نے اس کا شانہ تھپتھپاتے ہوئے کہا۔

''جی ان شاء اللہ فراز بھائی۔'' سعد نے پرجوش انداز میں کہا۔

''ہاں ضرور۔ اللہ تعالیٰ ہمیشہ اچھے لوگوں کا ساتھ دیتا ہے۔ مگر میرے عزیز بھائی۔ ہر چیز میں اعتدال بھی ضروری ہے۔ آج اتوار کی وجہ سے جب تم اپنی پڑھائی پر خصوصی توجہ دے رہے ہو تو اپنے ذہن کو تر و تازہ کرنے کے لیے آج تمہیں صبح اور شام تھوڑی تھوڑی دیر ضرور کھیلنا چاہیے۔ چلو آؤ ایک میچ ہو جائے ریکٹ کا۔

کیا خیال ہے؟'' فراز بھائی نے سعد کی طرف سوالیہ نظروں سے دیکھتے ہوئے کہا۔

''بہت نیک خیال ہے چلیے۔'' سعد نے ریکٹ اور شٹل اٹھاتے ہوئے کہا۔ پھر وہ دونوں گھر کے قریبی گراؤنڈ میں پہنچ گئے۔ میچ شروع ہو گیا۔ اچانک کھیلتے کھیلتے جب سعد نے اپنے شارٹ کو کور کرنے کی کوشش میں ہلکی سی چھلانگ لگائی تو توازن بگڑنے کے باعث وہ گر پڑا۔ اس کی پوری ایڑی گھوم گئی۔ جس کی وجہ سے اس کے ٹخنے میں فریکچر ہو گیا۔ فراز بھائی اسے لے کر اسپتال بھاگے اور سعد کے گھر والوں کو اطلاع کی۔ ڈاکٹر نے اس کے پلاسٹر باندھا اور ضروری ہدایات کے ساتھ گھر جانے کی اجازت دے دی۔ سعد گھر آ گیا۔ اسی شام، اس کے عزیز و اقارب، اساتذہ اور اسکول اور محلے کے کئی دوست عیادت کرنے اس کے گھر پہنچے۔ ان سب جانے کے بعد جب سعد سونے کے لیے لیٹا تو ایک خیال آتے ہی اس کی نیند اڑ گئی۔ سالانہ امتحان میں صرف چار مہینے باقی تھے اور پھر یہ حادثہ رونما ہو گیا۔ اب وہ کس طرح اپنا مطلوبہ ہدف حاصل کر سکے گا۔ دوسری صبح اس نے فوراً فراز بھائی کو فون کیا اور اپنی پریشانی بیان کی۔ انہوں نے سعد کو تسلی دی اور کہا کہ وہ اطمینان رکھے۔ وہ آج ہی اس کے پرنسپل سے ملاقات کر کے اس مسئلے کا حل نکالیں گے۔ سعد بے چینی سے فراز بھائی کی آمد کا انتظار کرنے لگا۔ بالآخر انتظار کی گھڑیاں ختم ہوئیں اور فراز بھائی دن کے گیارہ بجے کے قریب سعد کے گھر پہنچ گئے۔ مگر وہ یہ دیکھ کر حیران ہو رہا تھا کہ فراز بھائی اسے کچھ بتانے کے بجائے گم صم اور چپ چاپ بیٹھے تھے۔ پھر سعد کے بے انتہا اصرار پر آخر کار فراز بھائی نے بولنا شروع کیا۔

''میں تمہارے اسکول میں تمہارے پرنسپل اور اساتذہ سے ملا اور ان سے تمہاری پریشانی کا تذکرہ کیا تو انہوں نے کہا کہ میں تمہاری کلاس میں جا کر چند اچھے پڑھنے والے بچوں سے ملوں اور ان سے کہوں کہ وہ اپنے مضامین کی کاپیاں تمہیں وقتاً فوقتاً دے دیا کریں تاکہ تم اپنا کام مکمل کرتے رہو۔ ریاضی کی مشقوں اور انگلش گرامر کے حوالے سے تو میں تمہاری مدد کر سکتا ہوں۔ اس لیے اس کا کوئی مسئلہ نہیں۔ مگر مجھے یہ دیکھ کر شدید حیرانی اور افسوس ہوا کہ کسی لڑکے نے بھی مجھے اپنی مدد کی پیش کش نہیں کی۔ میں معافی چاہتا ہوں پیارے بھائی سعد کہ میں تمہاری مدد نہیں کر سکا۔''

''نہیں فراز بھائی اس میں آپ کا کوئی قصور نہیں۔ یہ میری سزا ہے جو میرے اپنے رویے کی وجہ سے مجھے ملی ہے۔ آپ سب کہتے تھے نا کہ میں کسی کی مدد نہیں کرتا۔ پس آج مجھے میرے کیے کی سزا مل ہی گئی۔ جب میں نے کبھی کسی کی مدد نہیں کی تو بھلا میں کیسے کسی سے مدد کی امید رکھ سکتا ہوں۔ مجھ جیسے لوگوں کے ساتھ ایسا ہی ہونا چاہیے۔'' اتنا کہہ کر سعد زار و قطار رونے لگا تو فراز بھائی نے اٹھ کر اسے گلے لگا لیا اور کہا۔ ''سعد جب کسی شخص کو اپنی غلطی کا احساس ہو جائے تو یہ اس کا نیکی کی جانب پہلا قدم ہوتا ہے۔ اب تم شرم سار ہو۔ اللہ تعالیٰ سے گڑگڑا کر اپنی کوتاہیوں کی معافی مانگو اور اس سے وعدہ کرو کہ تم آئندہ کبھی بھی کسی کی مدد کرنے سے انکار نہیں کرو گے۔ اللہ تعالیٰ بڑا رحیم و کریم ہے۔ وہ سچے دل سے توبہ کرنے والوں کو ضرور معاف فرماتا ہے۔'' اور پھر اس دن سعد نے اللہ سے رو رو کر اپنے سابقہ رویے کی اللہ کے حضور معافی مانگی اور آئندہ ایسی غلطی نہ دہرانے کا عہد کیا۔ یہی عزم دل میں پکا کرتے کرتے وہ سو گیا۔ جب شام کو وہ اٹھا تو اس نے دیکھا کہ اس کی طرح پوزیشن حاصل کرنے والے دوسرے سیکشن کے بلال اور عامر اس کے کمرے میں موجود ہیں۔

''تم لوگ یہاں......؟'' سعد نے حیرت سے پوچھا۔

''ہاں سعد کل ہمیں ہمارے والدین اور اساتذہ نے بہت ڈانٹا کہ برے کام کی تقلید کرنے کے بجائے ہمیں اس کے خاتمے کی کوشش کرنی چاہیے۔ پہلے ہم نے تمہیں سبق سکھانے کا فیصلہ کیا تھا۔ مگر جب ہمیں فراز بھائی کے ذریعے تمہاری شرمندگی اور غلطی ماننے اور توبہ کرنے کے بارے میں پتا چلا تو ہم نے سوچا کہ ہم روزانہ اسکول سے واپسی پر ایک گھنٹہ تمہارے ساتھ بیٹھ کر تمہارا کام مکمل کروانے میں تمہاری مدد کیا کریں گے اور ان شاء اللہ تم جلد صحت یاب ہو جاؤ گے اور ہمیشہ کی طرح اس مرتبہ بھی پوزیشن حاصل کر سکو گے۔''

''ان شاء اللہ۔'' فراز بھائی نے کہا، جو دروازے پر کھڑے ان کی باتیں سن رہے تھے اور سعد بھی آنکھوں میں خوشی اور شکرانے کے آنسو لیے مسکرا دیا۔

☆☆☆

جج صاحب دانت نکلوانے کے لیے ڈنٹسٹ کی کرسی پر بیٹھنے لگے تو جیسے انہیں کچھ یاد آیا۔ فوراً ڈنٹسٹ سے مخاطب ہوئے۔ ''حلف اٹھاؤ کہ تم دانت اور صرف دانت نکالو گے۔ دانت کے سوا کچھ نہیں نکالو گے۔'' (عفان عمار کھتران)

ایک آدمی اخبار پڑھ کر رو رہا تھا۔ دوسرے شخص نے پوچھا: ''کیا اخبار میں کوئی بری خبر چھپی ہے، جو اس طرح رو رہے ہو۔'' پہلے شخص نے جواب دیا: ''اخبار میں ایک مضمون چھپا ہے، جس کا عنوان ہے۔ ''رونے کے فائدے۔'' (سمیعہ توقیر، کراچی)

استاد (شاگرد سے): ''موسلا دھار کو جملے میں استعمال کرو۔

شاگرد: ''جناب مجھے موسلا دھار کا مطلب ہی نہیں آتا۔''

استاد: ''بہت تیز۔''

شاگرد: ''آج میں موسلا دھار دوڑا۔'' (آمنہ اختر، راول پنڈی)

ایک بے وقوف شخص روز کچن میں جاتا، چینی کا ڈبہ کھولتا اور بند کر دیتا...... کیوں؟

کیوں کہ ڈاکٹر نے اسے کہا تھا۔ اپنی ''شوگر'' روز چیک کیا کرو۔''

☆

بچہ: ''امی دس روپے دے دیں۔ ایک لڑکے کی مدد کرنی ہے۔''

ماں: ''کس کی مدد کرنی ہے؟''

بچہ: ''وہ لڑکا گلی میں کھڑا آئس کریم بیچ رہا ہے۔''

☆

استاد (شاگرد سے): ''مچھر اور ہاتھی میں کیا فرق ہے؟''

شاگرد: ''مچھر، ہاتھی کو کاٹ سکتا ہے مگر ہاتھی، مچھر کو نہیں کاٹ سکتا۔''

(سارہ ارشد، سرگودھا)

ادریس احمد (لطیف سے): ''ایسا کیا کریں کہ سانپ بھی مر جائے اور لاٹھی بھی نہ ٹوٹے۔''

لطیف (ادریس احمد سے): ''جوتے سے مار دو۔''

☆

حنیف اپنے دوست (حلیم سے): ''تم کہہ رہے تھے کہ بلی کو کہیں جنگل میں چھوڑ آئے ہو مگر یہ تو یہیں نظر آ رہی ہے۔

حلیم (حنیف سے): ''ہاں میں اسے چھوڑ آیا تھا مگر میں ہی راستہ بھول گیا اور گھر واپس آنے کے لیے اس کا پیچھا کرنا پڑا۔

(ثروت یعقوب، لاہور)

اعجاز (منے سے): ''کیا تم پاس ہو گئے؟''

منے نے خوش ہو کر کہا۔ ''ہاں! مگر ماسٹر صاحب فیل ہو گئے ہیں وہ ابھی تک ایک ہی کلاس کو پڑھا رہے ہیں۔'' ☆

مریض (ڈاکٹر سے): ''اگر آنکھوں میں مرچ گر جائے تو کیا کرنا چاہیے۔''

ڈاکٹر: ''فوراً دو چمچ چینی ڈال لینی چاہیے۔'' (مائرہ حنیف، بہاول پور)

استاد (شاگرد سے): ''آج تم دیر سے کیوں آئے ہو؟''

شاگرد: ''جناب میں گر گیا تھا اور لگ گئی تھی۔''

استاد: ''کہاں گر گئے تھے اور کیا لگ گئی تھی؟''

شاگرد: ''جناب! چارپائی پر گر گیا تھا اور آنکھ لگ گئی تھی۔''

☆

کاشف (نادر سے): ''تمہارے دادا جان کس طرح فوت ہوئے؟''

نادر: ''انہیں بھول جانے کی عادت تھی۔ ایک دن سانس لینا بھول گئے۔ اس لیے فوت ہو گئے۔'' (مصباح صدف مبشر، جھنگ)

حمید: ''تم تو کہتے تھے کہ میں بہت اچھا نشانے باز ہوں۔ ہرن کے دل پر تیر ماروں گا لیکن تمہارا تیر تو ہرن کی ٹانگوں پر جا کر لگا ہے۔''

زید: ''تم نہیں جانتے کہ ہرن کا دل اس کی ٹانگوں میں ہوتا ہے۔''

(حمزہ، عثمان، چونیاں)

وکیل گواہ سے: ''تمہیں لکھنا پڑھنا آتا ہے۔''

گواہ: ''جی لکھنا آتا ہے، پڑھنا نہیں آتا۔''

وکیل: ''اپنا نام لکھو۔''

گواہ نے کاغذ پر کچھ الٹی سیدھی لکیریں ڈال دیں۔

وکیل نے پوچھا۔ ''یہ کیا لکھا ہے؟''

گواہ: ''جناب میں نے پہلے کہا تھا، مجھے لکھنا آتا ہے پڑھنا نہیں۔''

(مریم، عائشہ، چونیاں)

بے زبان

بنت محمد اقبال، پشاور

نافع عجیب سی کشمکش میں مبتلا تھا۔ اس کے اور اس کے ضمیر کے درمیان بہت سخت مقابلہ جاری تھا۔ اسے اپنی ماں کا علاج کرانے اور اپنے چھوٹے بہن بھائیوں کو پڑھانے اور گھر کا خرچ چلانے کا صرف ایک ہی راستہ نظر آ رہا تھا جو کہ غلط تھا اور اس جیسے شریف نوجوان اور ایمان دار ماں کے بیٹے کے لیے اس راستے پر چلنا بہت ہی دشوار تھا لیکن اس نے اپنے ضمیر کو ہرا دیا اور اپنے دادا کا پستول آہستہ سے صندوق سے نکال لیا۔ اس وقت رات کے تین بج رہے تھے۔ نافع گھر کا دروازہ کھول کر باہر آ گیا۔ اب اس کا رخ اس سڑک کی طرف تھا جو ایسے علاقے کی طرف جاتی تھی جہاں امیروں کے بڑے بڑے بنگلے تھے۔ نافع نے کئی دن پہلے ان میں سے ایک گھر کا انتخاب کر لیا تھا۔ اس گھر کا چوکی دار شاید چھٹی کر گیا ہوا تھا اس لیے نافع کا کام اور بھی آسان ہو گیا اور وہ دیوار پھلانگ کر گھر کے اندر داخل ہو گیا۔ جیسے ہی وہ گھر کے کمروں کی طرف بڑھا اسے کچھ سرگوشی سنائی دی۔ وہ ادھر ادھر دیکھنے لگا لیکن اس کو کوئی نظر نہ آیا۔ اب سرگوشی کی آواز اسے صاف سنائی دینے لگی۔ یہ اس کے اعضاء کی گفتگو تھی۔ اس کے پاؤں کہنے لگے۔ ''یار! یہ کتنا بے وقوف ہے۔ یہ ایک اللہ پر یقین رکھتا ہے اور زبان سے کہتا بھی ہے کہ وہ ہر جگہ موجود ہے اور ہر کسی کو دیکھنے والا ہے اور پھر بھی اس کے سامنے اس کے ممنوع کردہ کام کر رہا ہے۔''

اس کے ہاتھ بولے۔ ''ہاں! تم صحیح کہتے ہو لیکن اس کی ماں کینسر کی مریضہ ہے اور اس سے پہلے اس کی ماں سارے گھر کا خرچ لوگوں کے گھروں میں کام کر کے چلاتی تھی اور اس نے نافع کو اپنی کمائی کے ذریعے تعلیم دلائی لیکن اب وہ بیمار ہے اور گھر میں کھانے کو کچھ نہیں ہے اور تو اور اس کی ماں کے علاج کے پیسے بھی نہیں ہیں۔ تو اب یہ بے چارہ کیا کرتا؟''

یہ سن کر اس کے کان بولے۔ ''ہمیں بھی اس کے حالات کا پتا ہے لیکن اس جیسے اچھے انسان کا ایمان اتنا کمزور کیسے ہو گیا؟ اس کو چاہیے کہ اللہ کے دروازے پر دستک دے، تو وہ اسے اس سے کئی زیادہ دے گا جو اسے اس چوری سے ملے گا۔''

''ہاں! تمہاری بات بالکل ٹھیک ہے۔'' نافع کی آنکھیں بولیں۔ ''یار! ہم یہ کب کہہ رہے ہیں کہ نافع ٹھیک کر رہا ہے اور اگر ہم اس کے ٹھیک یا غلط کرنے پر تبصرے کریں تو اسے کون سنے گا اور آج تو ہم نافع کے رحم و کرم پر ہیں، وہ جیسے چاہے ہمیں استعمال کرے۔ ہمارے منہ پر چپ کی مہر لگا دی گئی ہے لیکن قیامت کے دن ہم بولیں گے اور نافع کے خلاف گواہی دیں گے۔'' نافع کے ہاتھ انتہائی جذباتی ہو گئے۔ اور پھر اس کے سب اعضاء نافع کو ملامت کرنے لگے جس سے نافع کا سر چکرا گیا اور وہ ہڑبڑا کر اٹھ بیٹھا۔ ''اوہ! یہ خواب تھا الحمدللہ۔ یااللہ! تیرا لاکھ لاکھ شکر ہے کہ تو نے مجھے اس برے کام سے بچا لیا۔''

نافع خود سے گویا ہوا اور اس کے ساتھ ہی اس نے اپنی بیمار ماں اور بہن، بھائی کو دیکھا اور پھر ایک نظر گھڑی پر ڈالی تو ساڑھے تین بج رہے تھے۔ نافع نے وضو کیا اور باقی رات تہجد میں گزار دی اور صبح کی نماز مسجد میں ادا کی۔ جب نماز سے فارغ ہو کر وہ گھر آیا تو اس کی ماں نے اسے ایک خط تھمایا اور کہا کہ یہ کل شام کو آیا تھا لیکن میں تمہیں دینا بھول گئی تھی۔ نافع نے خط کھولا تو اس کی آنکھوں میں آنسو آ گئے اور وہ بے ساختہ سجدہ میں گر پڑا اور پھر اپنی ماں سے کہنے لگا۔ ''اماں! آپ کی دعا قبول ہو گئی۔ میں نے ایک ہفتہ پہلے جس کمپنی میں انٹرویو دیا تھا اس کے مالک نے مجھے منیجر رکھ لیا ہے اور مجھے گھر اور گاڑی بھی دے رہے ہیں اور آپ کا علاج بھی مفت کریں گے۔'' یہ سن کر اس کی ماں نے اللہ کا شکر ادا کیا اور نافع کا یقین اللہ تعالیٰ پر اور بھی پختہ ہو گیا۔

پہلا انعام: 195 روپے کی کتب

محبت وطن

ارسلان محمد ہاشم، کراچی

چلو یہ ہماری آخری پارٹی تھی اب پتا نہیں کب ملیں گے۔ یہ نوید کی آواز تھی جو اپنے تینوں دوستوں سے مخاطب ہو کر کہہ رہا تھا۔ ''کیا مطلب کب ملیں؟'' یہ توصیف تھا جو چونک کر بول پڑا۔

دراصل میں اپنے چچا کے ہاں منتقل ہو جاؤں گا۔ دبئی میں اور وہیں کام کروں گا۔ نوید نے جواب دیا۔ ہاں میں نے بھی اپنے فارم جمع کروا دیئے ہیں میں بھی لندن چلا جاؤں گا اور وہیں رہوں گا۔ یہ زاہد کی آواز تھی۔ کیا......؟ توصیف چونک کر بولا۔

''میں بھی اپنے بھائی کے ہاں امریکا جا رہا ہوں اور پھر شاید ہی پاکستان دوبارہ آؤں۔'' یہ عمران تھا جو غم زدہ لہجہ میں اپنے دوستوں سے کہہ رہا تھا۔ دراصل توصیف، نوید، زاہد اور عمران چاروں دوست تھے اور حال ہی میں انہوں نے اپنی تعلیم مکمل کی تھی اور کام کے سلسلے میں ایک دوسرے سے جدا ہونے جا رہے تھے۔

''تم لوگ پاگل ہو گئے ہو۔ تم اس ملک کو چھوڑ کر چلے جاؤ گے جس نے تمہیں اتنا بڑا مقام دیا؟'' یہ توصیف تھا جو بہت دیر سے ان کی باتیں سن رہا تھا غصہ میں بول اٹھا۔ ''ہاہاہا! یہ تم کیا کہہ رہے ہو توصیف لگتا ہے تمہارا دماغ خراب ہو گیا ہے......'' نوید ہنستے ہوئے بولا۔

''ہاں! تم کیا کہہ رہے ہو تمہارا مطلب ہے ہم اسی ملک میں رہیں جہاں ہماری کوئی قدر نہیں ہے؟'' زاہد نوید کی بات کاٹتے ہوئے بولا۔ ''آخر اس ملک میں کیا ہے جو ہم اس ملک میں رہیں؟ اس ملک کا کچھ نہیں ہو سکتا یہ کبھی آگے نہیں بڑھ سکتا۔ تم ایسا کرو میرے ساتھ امریکہ چلو۔'' یہ عمران کی آواز تھی۔ کیا تم لوگ ایسا سوچ بھی کیسے سکتے ہو اپنے ملک کے بارے میں۔ تم لوگ جیسی سوچ رکھنے والے ہیں اسی لیے ملک تیزی سے ترقی نہیں کر رہا۔ کیا تمہیں ذرا بھی اپنے وطن سے محبت نہیں؟ یہ توصیف تھا جو غصہ میں بول رہا تھا۔

''ہاہاہا! محبت؟ کیسی محبت؟ یہاں پورے سال میں صرف دو ہی جگہ محبت پائی جاتی ہے۔ ایک چودہ اگست کو اور دوسرا انڈیا پاکستان کے میچ میں۔'' یہ نوید تھا جو ہنس کر بول رہا تھا۔

''ٹھیک ہے تم رہو یہیں یہاں کچھ نہیں ہونے والا۔'' عمران بھی طعنہ مارتے ہوئے بولا۔

''مجھے تم لوگوں سے یہ امید نہ تھی تم لوگ اپنے ملک کو سپورٹ کرنے کی بجائے یہاں سے بھاگ رہے ہو۔ شرم آنی چاہیے تم لوگوں کو۔ میں نے بھی ایسے لوگوں سے دوستی رکھی......'' توصیف غم زدہ لہجہ میں بولا اور گھر کی طرف چل دیا۔

''ہاں! جاؤ جاؤ، ہمیں بھی تم سے بات کرنے کا کوئی شوق نہیں خدا حافظ۔'' زاہد نے طنز کیا۔

آخر سب اپنی اپنی منزل کی طرف چل پڑے کوئی دبئی کوئی لندن اور کوئی امریکہ۔ لیکن توصیف پاکستان میں ہی رہا اور کام ڈھونڈنے لگا لیکن افسوس! اسے کوئی اچھا کام نہ مل سکا۔ آخر تھک ہار کر اس نے کوئی چھوٹی سی نوکری کر لی اور گھر میں ٹیوشن بھی پڑھانے لگا۔

کئی سال تک اس کی اپنے دوستوں سے بات نہ ہو سکی۔ لیکن اس کے تینوں دوستوں کا آپس میں ابھی بھی تعلق برقرار تھا۔

تقریباً آٹھ سال گزر گئے زاہد، نوید اور عمران نے ایک بار پھر پاکستان کا ایک چکر لگانے کا ارادہ کیا۔ تینوں ہمیشہ کی طرح اسی جگہ ملے جہاں وہ اکثر ملا کرتے تھے لیکن آج وہاں ایک شخص کی جگہ خالی تھی جو توصیف کی تھی۔

آخرکار سب کچھ بھلا کر وہ توصیف سے ملنے اس کے گھر چل دیئے لیکن آج وہاں کوئی گھر نہ تھا بلکہ توصیف اکیڈمی کے نام سے ایک عالی شان اسکول قائم تھا۔ تینوں کی آنکھوں میں خوشی کے آنسو چمکنے لگے۔ خوشی کے ساتھ تینوں اندر داخل ہوئے اور پورے اسکول کو دیکھا۔ ہر چیز اس اسکول میں موجود تھی۔ اسکول کے آفس میں ایک تصویر لگی ہوئی تھی جو ان چاروں دوستوں کی تھی۔ وہ توصیف کو بے صبری سے ڈھونڈ رہے تھے۔

توصیف اب اس دنیا میں نہیں رہا تھا۔ تینوں کی نظریں شرم سے جھک گئیں۔ کچھ دیر وہ اسی طرح کھڑے رہے۔ کچھ ماہ پہلے ہی توصیف کی ایک کار حادثے میں موت ہو چکی تھی۔ ان کی آنکھوں سے آنسو بہہ رہے تھے۔ انہیں یقین نہیں آ رہا تھا۔ بس کچھ دیر بعد وہ سیدھے کھڑے ہوئے، اپنے ہاتھوں کو بلند کیا، پہلے معافی مانگی پھر دعا کی اور بلند آواز میں سلام پیش کیا اور چل دیئے۔

توصیف اب اس دنیا میں موجود نہ تھا مگر اس کا نام ہمیشہ کے لیے دنیا میں رہ گیا تھا۔ وہ محبت وطن تھا اور لوگ اسے عزت سے یاد کرتے۔

دوسرا انعام: 175 روپے کی کتب

شرارتیں

سیدہ فاطمہ ذیشان، بہاول پور

ابو گئے تو گویا پورے گھر میں آفت آ گئی۔ سارے گھر کا نظام درہم برہم ہو گیا۔ ماہم ابو جان کی بے حد لاڈلی تھے۔ کسی کی اتنی جرأت نہ تھی کہ اسے زبان تک چڑائے۔ اب تو بھائیوں کی موجیں شروع ہو گئیں ہمیں ان کی شرارتوں کے آغاز کے بارے میں تب پتا چلا جب یہ واقعہ گزرا۔ ہوا یوں کہ ایک رات بھائی کی آواز سے ہماری آنکھ کھلی۔ وہ ہمارے بستر پر بیٹھے تھے اب جو انہوں نے بولنا شروع کیا تو حیرت کے سینکڑوں پہاڑ ہم پر ٹوٹنے لگے۔ بھائی جان کا کہنا تھا کہ ہم نے گرمیوں کی ساری چھٹیاں دن رات سوتے ہوئے گزاری اور خوش قسمتی سے اسکول جانے کے عین وقت پر ہماری آنکھ کھلی۔ اس لیے ہمیں اب اسکول جانے کی تیاری کرنی ہے آپ تو ہمیں بے حد بے وقوف سمجھ رہے ہوں گے۔ لیکن وہ بھی تو آخر ہمارے بھائی تھے، بدھو بنانے میں کوئی کسر نہ چھوڑی تھی۔ ہمیں سخت افسوس ہوا کہ سال میں ایک ہی مرتبہ تو گرمیوں کی چھٹیاں آتی ہیں، ان میں بھی ہم مزے نہ کر سکے۔ بھائی پوری تیاری کے ساتھ ہمارے پاس آئے تھے۔ الارم لگایا ہوا، پردے بند (تاکہ پتا نہ چلے کہ رات کو کون سا پہر چل رہا ہے)، یونی فارم، ٹائی اور بیگ تک زیب تن فرمایا ہوا تھا۔ خیر، منہ بسورتے ہوئے اٹھے، بھاگم بھاگ کچن میں تشریف لائے، معمول کے مطابق خود ناشتا تیار کیا اور کھانے لگے۔ دو لقمے ہی لیے تھے کہ ساری صورت حال سمجھ میں آ گئی جب امی ہمارے سامنے کھڑی ساڑھے ایک بجے یونی فارم پہن کر ناشتا کرنے پر ہمیں ڈانٹ رہی تھیں اور ساتھ ہی بار بار پوچھ رہی تھیں، بیٹا! دماغ تو ٹھیک ہے ناں؟ رات کو صحیح طرح کھانا کھایا تھا؟ 'امی اس ڈانٹ اور چیخنے کے اصل حق دار ہم نہیں' ہمارے محترم بھائی ہیں، ہم نے جواباً (دانت پیستے ہوئے) کہا۔ جب بھائی کی خبر لینے کے لیے ہم امی کے ساتھ کمرے میں داخل ہوئے تو دیکھا کہ موصوف بڑے آرام سے گھر کے کپڑوں میں ملبوس بستر پر پڑے خواب خرگوش کے مزے لوٹ رہے تھے۔ اس وقت سے آج تک امی یہ سوچتی آ رہی ہیں کہ شاید اس رات ہمارے دماغ میں کوئی خلل واقع تھا۔

اس واقع کو گزرے ہوئے ایک دن بھی نہ ہوا تھا کہ شام کو ننھے بھائی دانیال نے ہمیں یہ کہہ کر بلایا کہ وہ چھپ رہا ہے اور ہمیں اسے ڈھونڈنا پڑے گا۔ ''ہمیں اسکول کا کام کرنے دو۔'' ہم نے فوراً انکار کیا، لیکن جب چاکلیٹ کی لالچ دی گئی تو بے اختیار ہمارے قدموں نے کمرے کا رخ کیا۔ وہاں پہنچ کر ہم بڑے احتیاط سے کمرے میں نظریں دوڑانے لگے کیوں کہ ہم نے اندازہ لگا لیا تھا کہ یہ بھی ہمارے بھائیوں کی کوئی سازش ہے۔ خیر، ہم ابھی ڈھونڈ رہے تھے کہ اچانک بستر کے نیچے سے عجیب و غریب آوازیں آنے لگیں۔ بے اختیار ہمارے ذہن میں بھوت اور چڑیلیں گردش کرنے لگیں۔ دل تھام کر ہم نے بستر کے نیچے دیکھا تو ہماری حالت ایسی ہو گئی کہ گویا کاٹو تو بدن میں لہو نہیں۔ نیچے سچ مچ ایک چڑیل لیٹی ہوئی تھی۔ اس نے ہمیں دیکھتے ہی ایک خونی مسکراہٹ سے ہمارا استقبال کیا۔ ہمیں سوچنے کا موقع دیئے بغیر وہ پھرتی سے بلی کی طرح ہم پر جھپٹی اور پیٹ کے بل گرا دیا۔ اس کی شکل بھائی جیسی تھی اور میرا گاؤن پہنا تھا۔ ابھی ہم اس کا معائنہ کر ہی رہے تھے کہ یک دم محسوس ہوا جیسے ہماری کمر برف میں تبدیل ہو گئی ہے۔ ظاہر ہے اگر کوئی فریزر سے ٹھنڈا یخ پانی کے ساتھ برف کے چند ٹکڑے آپ کی کمر پر انڈیل دے تو کیا حالت ہو گی! اس کے بعد کیا تھا، پورا گھر ہماری ہول ناک چیخوں کا شکار ہو گیا۔ جب ابو آئے تو ان کی گود میں بیٹھ کر (حالاں کہ ہم 13 سال کے ہو گئے تھے)، دل کھول کر خوب نمک مرچیں لگا کر، معصومیت سے شکائتیں لگائیں، مگر یہ کیا، خلاف توقع ابو ہماری کم عقلی اور مزے کی شرارتیں سن کر کھلکھلا کر ہنس پڑے اور ہم اپنا سا منہ لے کر رہ گئے۔ ابو نے ہماری خاطر بھائیوں کو ڈانٹ تو دیا لیکن ساتھ ہی انہیں اتنی مزے دار سازشوں پر داد بھی دی۔ اپنے بارے میں سوچتے ہوئے ہمیں یک دم خیال آیا کہ ہمارے ابو تو محض چند دنوں کے لیے گئے تھے اور ہم پر کیا کچھ گزری تو جن کے ابو ہمیشہ کے لیے اس دنیا سے چلے جاتے ہیں وہ کتنے باہمت اور صابر بچے ہوں گے۔ ہے ناں سوچنے کی بات!

تیسرا انعام: 125 روپے کی کتب

احساس

میمونہ نوید، راول پنڈی

اسد کی دادی اماں اچانک بہت بیمار ہو گئیں۔ امی اور ابو ان کو لے کر ڈاکٹر کے پاس گئے ڈاکٹر نے دوا کے ساتھ ہدایت کی کہ ان کی مکمل دیکھ بھال کی جائے۔ گھر آنے کے بعد امی نے دادی کو ڈاکٹر کی ہدایت کے مطابق دوا پلائی اور انہیں آرام کرنے کو کہا۔ دادی اماں ایک دو گھنٹے سو کر کچھ بہتر ہوئیں لیکن ابھی تک بخار تھا۔ سب لوگ ان سے ملنے آتے اور آ کر چلے جاتے۔ سب مصروف تھے۔ دادی اماں تو ایک کام کرنے والی خاتون تھیں۔ اس طرح اکیلے لیٹ کر ان کی طبیعت زیادہ خراب ہونے لگی۔

اگلے دن اسد اسکول بھی نہ جا سکا۔ اس کا سارا وقت بستر پر گزرا۔ اسد اکیلے کمرے میں لیٹ لیٹ کر گھبرا گیا۔ وہ چاہ رہا تھا کہ کوئی اس کے پاس آ کر بیٹھے لیکن امی بھی زیادہ وقت نہ دے سکتی تھیں۔ انہیں سارے گھر کا کام کرنا تھا۔ دن کو آمنہ اسکول سے آئی تو امی نے سب کو کھانا دیا۔ دادی اماں اور اسد کو دوائی دی۔ اسد کا دل چاہا کہ آمنہ اس کے پاس بیٹھے مگر وہ کھیلنے لگی۔ شام کو ابو بھی اسد کا حال پوچھ کر اپنے کمرے میں چلے گئے۔ اسد بہت بے چین تھا۔ اسے دادی اماں کا خیال آیا جو کہ ایک ہفتے سے بیمار تھیں اور کمرے میں اکیلی لیٹی ہوئی تھیں۔ وہ فوراً بستر سے اٹھا اور دادی اماں کے پاس چلا گیا۔ دادی اماں نے اسے اپنے پاس لیٹا لیا اور دعا پڑھ کر اس کے ماتھے پر پھونک دی۔ اسد کو تو جیسے سکون آ گیا۔ دادی اماں آہستہ آہستہ اس کا سر دباتی رہیں۔ ان کا ہاتھ گرم تھا۔ اسد کو محسوس ہوا کہ انہیں ابھی بھی بخار ہے۔ اسے افسوس ہونے لگا کہ اتنے دن ان کے ساتھ کسی نے ٹھیک سے وقت نہیں گزارہ۔

طبیعت خراب ہونے کے باوجود انہوں نے اسد کو ایک مزے دار کہانی بھی سنائی۔ دو دن میں اسد کی طبیعت ٹھیک ہو گئی اور وہ اسکول جانے لگا۔ اب اس کو احساس ہوا اکیلا بیمار انسان کبھی بھی جلد تندرست نہیں ہو سکتا۔ بیمار کی دیکھ بھال کے لیے اسے دوا کے ساتھ ساتھ توجہ کی بھی ضرورت ہوتی ہے۔ وہ باقاعدگی سے دادی اماں کے پاس بیٹھنے لگا۔ جب سب گھر والوں نے دادی اماں کو وقت دینا شروع کیا تو وہ جلد صحت یاب ہو گئیں۔

چوتھا انعام: 115 روپے کی کتب

واپسی

محمد عثمان علی، پشاور

کسی جنگل کے کنارے ایک بستی آباد تھی۔ اس بستی میں ایک خاتون اپنے دو بیٹوں کے ساتھ رہتی تھی۔ احمد اور اسد دونوں بہت سست اور کاہل تھے، کسی کام کو ہاتھ نہیں لگاتے تھے۔ بس سارا دن کھانا پینا اور سونا یا گھر سے باہر جنگل میں آوارہ گردی کرنا ان کا کام تھا۔ ایک دن وہ دونوں اپنی امی سے پوچھے بغیر جنگل میں کھیل رہے تھے کہ اچانک ایک آواز نے انہیں چونکا دیا، انہوں ے ادھر ادھر دیکھا تو ایک پرندہ نظر آیا جو انہوں نے پہلے کبھی نہیں دیکھا تھا۔ اب وہ لگے اس پرندے کو پکڑنے، اس چکر میں وہ بہت دور آ گئے۔ پرندہ تو ان کے ہاتھ نہ آیا اور گھر کا راستہ بھی وہ بھول گئے۔ چلتے چلتے انہیں آم کا درخت نظر آیا۔ دونوں تو سدا کے پیٹو تھے اس لیے پیلے پیلے آم دیکھ کر ان کے منہ میں پانی بھر آیا۔ احمد نے اسد سے کہا۔ ”ایسا کرتے ہیں تم میرے کندھوں پر چڑھ کر درخت سے آم توڑ لو۔“ اسد مان گیا۔ ابھی اس نے ایک شاخ پر ہاتھ رکھا ہی تھا کہ شہد کی مکھیوں نے اس پر حملہ کر دیا اور وہ بوکھلا کر نیچے گر پڑا۔ دونوں اس نئی افتاد سے بچنے کے لیے بھاگ اٹھے۔ اچانک احمد کا پاؤں ایک پتھر سے جا ٹکرایا اور وہ گر پڑا۔ اسد، احمد کو سنبھالنے کے لیے رکا تو احمد کے پھیلے ہوئے پاؤں سے الجھ کر گر پڑا۔ یوں دونوں زخمی ہو گئے۔ تھوڑی دیر بعد وہ گرتے پڑتے روانہ ہوئے رات ہونے کو تھی اس لیے وہ بہت خوف زدہ تھے۔ ایک جانب سے شیر کی دھاڑ سن کر ان کے رہے سہے اوسان بھی خطا ہو گئے اور وہ زخمی حالت میں ہی ایک طرف کو بھاگ اٹھے۔ اندھیرے کی وجہ سے وہ ایک درخت سے جا ٹکرائے۔ سر پر چوٹ لگنے اور زیادہ خون بہنے کی وجہ سے بہت جلد وہ دونوں بے دم ہو کر گر پڑے۔ انہیں اپنا کوئی ہوش نہ رہا۔ جب ان کو ہوش آیا تو ان کی بستی کا ایک آدمی ان کی مرہم پٹی کر رہا تھا۔ یہ آدمی بستی سے سامان لے کر صبح سویرے نکلتا اور شہر سے رات گئے واپس آتا تھا۔ انہیں ہوش میں آتا دیکھ کر اس نے پوچھا۔ احمد اور اسد نے اپنی سرگزشت سنائی۔ وہ سن کر بہت ہنسا اور کہا۔ ”تمہیں اپنی ماں کو ستانے کی سزا مل گئی۔ جلدی آؤ میں تمہیں تمہارے گھر چھوڑ آؤں۔ اب کبھی اپنی ماں کی نافرمانی نہ کرنا۔“ وہ دونوں اس آدمی کی بیل گاڑی میں سوار ہو گئے۔ بستی پہنچے تو رات بہت گہری ہو چکی تھی۔ انہوں نے دیکھا کہ ان کی ماں دروازے میں کھڑی تھی۔ دونوں بھاگ کر اس سے لپٹ گئے۔ انہوں نے اپنی ماں سے معافی مانگی اور وعدہ کیا کہ اب وہ بھی دوسرے بچوں کی طرح اسکول جایا کریں گے اور دل لگا کر پڑھیں گے۔ ان کی ماں یہ بات سن کر بہت خوش ہوئی اور کہا۔ ”کھانا کھا کر تم دونوں جلدی سو جانا کیوں کہ صبح تم دونوں کو جلدی اٹھنا ہے تاکہ وقت پر اسکول پہنچ سکو۔“

اگلے دن کا سورج پوری آب و تاب سے نکلا تھا۔ شاید سورج بھی ان دونوں کی توبہ کرنے پر خوش تھا۔

پانچواں انعام: 95 روپے کی کتب

☆☆☆

لیاقت علی خان سال بہ سال

غلام حسین میمن

☆ یکم اکتوبر 1895ء (بہ مطابق 11 ربیع الاول 1313 ہجری) لیاقت علی خان، نواب رستم علی خان کے گھر کرنال (بھارت) میں پیدا ہوئے۔

☆ 1910ء لیاقت علی خان تعلیم حاصل کرنے علی گڑھ گئے۔

☆ 1914ء ان کی پہلی شادی اپنی چچا زاد جہانگیرہ بیگم سے ہوئی۔

☆ 1918ء علی گڑھ کالج سے بی اے کیا۔ اسی سال ان کے والد نواب رستم علی خان کا انتقال ہوا۔

☆ 1919ء ان کا پہلا بیٹا ولایت علی خان پیدا ہوا۔ اسی سال وہ اعلیٰ تعلیم کے لیے انگلستان روانہ ہوئے۔

☆ 1920ء پہلے کیتھرائن کالج اور پھر آکسفورڈ کے Exeter کالج میں داخلہ لیا۔ محنت اور امتحان میں کام یابی کے بعد 1921ء میں ایم اے ڈگری لی۔

☆ 1922ء انر ٹیمپل سے بیرسٹری کی سند حاصل کی۔

☆ 1923ء ہندوستان واپس آئے۔ یوپی کے شہر مظفر نگر میں رہائش اختیار کی۔ اسی سال آل انڈیا مسلم لیگ میں شامل ہوئے۔

☆ 1924ء لاہور میں منعقدہ مسلم لیگ کے اجلاس میں پہلی بار باقاعدہ طور پر شرکت کی۔

☆ 1926ء یوپی (اترپردیش) اسمبلی کے رکن منتخب ہوئے۔

☆ 1928ء کلکتہ میں منعقدہ نیشنل کنونشن میں ہندو رپورٹ پر بحث کے لیے مسلم لیگ کے وفد میں شامل ہوئے۔ یہیں ان کی پہلی باقاعدہ ملاقات قائداعظم محمد علی جناح سے ہوئی۔

☆ 1932ء صوبائی تعلیمی کانفرنس میں مسلمانوں کے جداگانہ حیثیت کے بارے میں صدارتی خطبہ دیتے ہوئے فرمایا: ”مسلمانوں کی اپنی جداگانہ تہذیب و ثقافت ہے۔ مذموم فسادات کے دن بیت چکے۔ ہم نے برسوں کی تاریخ میں دیکھا ہے کہ متحدہ ہندوستان میں دونوں قوموں کے جداگانہ ورثے ہیں۔ ہم نے انہیں محفوظ رکھنے کی کوشش کی ہے۔“

☆ 1933ء بیگم رعنا سے دہلی میں شادی ہوئی۔ اس سال قائداعظم محمد علی جناح نے بہ حیثیت صدر، مسلم لیگ کے لیاقت علی خان کو آل انڈیا مسلم لیگ کا اعزازی جنرل سیکرٹری مقرر کیا۔

☆ 1937ء (13 اکتوبر) ان کے بیٹے اشرف شملہ میں پیدا ہوئے۔

☆ 1940ء مرکزی قانون ساز اسمبلی کے رکن منتخب ہوئے۔

☆ 1941ء (10 اپریل) ان کے تیسرے صاحبزادے اکبر پیدا ہوئے۔ اسی سال مدراس میں منعقدہ مسلم لیگ کے اجلاس میں لیاقت علی خان نے تجویز پیش کی کہ قرارداد پاکستان کو مسلم لیگ کے آئین میں شامل کیا جائے۔ انہوں نے اس موقع پر فرمایا: ”اب پاکستان ہی ہمارا جزو ایمان ہے۔“

☆ 1943ء قائداعظم محمد علی جناح پر قاتلانہ حملہ میں بچ جانے پر، لیاقت علی خان کی اپیل پر پوری مسلمان قوم نے ”یوم تشکر“ منایا۔

☆ 1943ء آل انڈیا مسلم لیگ کا اجلاس کراچی میں منعقد ہوا۔ قائداعظم نے ایک بار پھر مسلم لیگ کے اعزازی جنرل سیکریٹری کے لیے لیاقت علی خان کا نام تجویز کرتے ہوئے فرمایا تھا:

”نواب زادہ لیاقت علی خان میرے دستِ راست (Right hand) رہے ہیں۔ انہوں نے مسلم لیگ کے لیے شبانہ روز محنت کی ہے۔ انہیں دنیا بھر کے مسلمانوں بالخصوص ہندوستان کے مسلمانوں میں مقبولیت حاصل ہے۔ جنرل سیکریٹری کے عہدے کے لیے میری نظر میں ان سے بہتر کوئی شخص نہیں ہے۔

☆ 1945ء شملہ کانفرنس میں لیاقت علی خان نے مسلم لیگ کی

نمائندگی کی۔ اسی سال قائداعظم نے ایک بار پھر ان الفاظ میں ان کی خدمات کوخراج تحسین پیش کیا:
''گاندھی کے پاس بہت سے لوگ ہوں گے جن پر وہ تکیہ کرتے ہوں گے، میرے پاس صرف لیاقت ہے۔''

☆ 1946ء (16 اگست) یوم راست اقدام (Direct Action Day) کے موقع پر سب نے اپنے خطابات واپس کیے تو انہوں نے بھی اپنے نام کے ساتھ لفظ ''نواب زادہ'' ختم کر دیا۔ حالاں کہ یہ خطاب انگریز سرکار کا عطا کردہ نہ تھا۔ وہ خود ایک جاگیر کے مالک تھے، مگر پھر بھی انہوں نے اس امتیازی نشان کو مٹا دیا۔''

☆ 1946ء (26 اکتوبر) وائسرائے ہند لارڈ ویول نے عبوری حکومت کے قیام کا اعلان کیا اور لیاقت علی خان کو ''وزیر خزانہ'' کا قلم دان سونپا گیا۔

☆ 1946ء (یکم دسمبر) لارڈ ویول کے ساتھ قائداعظم محمد علی جناح، ہندو، لیاقت علی خان اور سردار بلدیو سنگھ برطانوی حکومت سے مذاکرات کے لیے لندن روانہ ہوئے۔ انہوں نے برطانوی وزیراعظم ایٹلی سے بھی ملاقات کی۔

☆ 1947ء (28 فروری) لیاقت علی خان نے عبوری حکومت کا پہلا بجٹ برائے مالی سال اپریل 47ء تا مارچ 48ء اسمبلی میں پیش کیا۔ ان کا یہ بجٹ غریب آدمی کے بجٹ کے نام سے مشہور ہوا۔

☆ 1947ء (4 جولائی) ایک خط کے ذریعے وائسرائے ہند لارڈ ماؤنٹ بیٹن کو مطلع کیا کہ مسلم لیگ نے فیصلہ کیا ہے کہ پاکستان کے گورنر جنرل قائداعظم محمد علی جناح ہوں گے۔

☆ 1947ء (19 جولائی) سرکاری اعلان کے مطابق لیاقت علی خان کو پاکستان کا پہلا وزیراعظم نامزد کیا گیا۔

☆ 1947ء (11 اگست) پاکستان کی دستور ساز اسمبلی میں پاکستانی پرچم پیش کرتے ہوئے کہا۔ ''کسی قوم کا پرچم محض کپڑے کا ٹکڑا نہیں ہوتا، یہ ان لوگوں کی آزادی اور مساوات کا ضامن ہوتا ہے جو اس سے وفاداری کا عہد کرتے ہیں۔ یہ پرچم شہریوں کے جائز حقوق کی حفاظت کرے گا۔ اس کے ساتھ ساتھ پاکستان کی بھی سلمیت کی حفاظت اور اس کا دفاع کرے گا۔''

1947ء، (12 اگست) دستور ساز اسمبلی میں لیاقت علی خان نے یہ قرار داد پیش کی کہ آئندہ سے سرکاری طور پر محمد علی جناح کو ''قائداعظم محمد علی جناح'' کہا اور تمام سرکاری دستاویزات پر لکھا جائے۔''

☆ 1947ء (15 اگست) لیاقت علی خان نے ملک کے پہلے وزیراعظم کی حیثیت سے حلف اٹھایا۔ ان کے پاس دفاع اور خارجہ کے محکمے بھی تھے۔

☆ 1947ء (یکم نومبر) کشمیر کی صورت حال پر تبادلۂ خیال کے لیے لارڈ ماؤنٹ بیٹن اور ازمے لاہور آئے۔ لیاقت علی خان نے ان سے ملاقات کی۔

☆ 1947ء (17 نومبر) کراچی میں تقریر کرتے ہوئے انہوں نے فرمایا: ''وزارت عظمیٰ کی چمک دمک میرے لیے بے معنی ہے۔ اگر مجھے یہ معلوم ہو کہ میں بہ طور چپراسی پاکستان کی بہتر خدمت کرسکتا ہوں تو میں انکار نہیں کروں گا۔''

☆ 1948ء (25 فروری) پاکستان کی دستور ساز اسمبلی میں تقریر کرتے ہوئے لیاقت علی خان نے فرمایا: ''صرف اردو ہی پاکستان کی سرکاری زبان ہوگی۔''

☆ 1948ء (19 اکتوبر) لیاقت علی خان، دولت مشترکہ کی کانفرنس میں شرکت کے لیے لندن روانہ ہوئے۔ پنڈت نہرو سے تبادلۂ خیال ہوا، اور برطانوی ماہر معاشیات سر اسٹیفورڈ کرپس سے بھی ملاقات ہوئی۔

☆ 1949ء (22 جنوری) پنجاب یونی ورسٹی نے انہیں ڈاکٹر آف لاز کی اعزازی ڈگری دی۔

☆ 1949ء، (7 مارچ) پاکستان کی دستور ساز اسمبلی میں لیاقت علی خان نے قرارداد مقاصد پیش کی۔

☆ 1949ء (16 ستمبر) کراچی میں ولیکا ٹیکسٹائل مل کا افتتاح کیا۔

☆ 1949ء (6 دسمبر) مالاکنڈ میں پن بجلی اسکیم کا افتتاح کیا۔

☆ 1950ء (29 جنوری) کراچی میں انڈونیشیا کے صدر سوئیکارنو کی آمد پر پرتپاک استقبال کیا۔

☆ 1950ء (4 فروری) لیاقت علی خان نے پاکستان ملٹری اکیڈمی کاکول میں پاسنگ آؤٹ پریڈ کی سلام لی۔

☆ 1950ء (8 اپریل) دہلی میں بھارت کے وزیراعظم ہندو سے اقلیتوں کے حقوق کے تحفظ سے متعلق معاہدہ کیا۔ یہ معاہدہ ''لیاقت نہرو پیکٹ'' تھا۔ (بقیہ: صفحہ نمبر 39 پر دیکھئے)

☆☆☆

ننھے قارئین

بوجھو تو جانیں

1- دنیا بھر کا دادا ہوں
سب پہ رعب جماتا ہوں
میرے پہلے تین حرف ہٹاؤ
مجھ پہ تم سواری بھی کر لو

2- میرے پیٹ میں میٹھے موتی
میرے کپڑے بے حد موٹے
میرا سر جو کاٹ دے کوئی
مجھ کو ہاتھ لگا کے جلے

3- اس ملک کا نام بتاؤ
جس کے حرف ہیں تین
آخر میں 'ی' جو لگا دیں
میٹھی چیز بنے اک حسین

4- جب بھی دستر خوان بچھایا
ایک ایسا مہمان بھی آئے
جوٹھا کر دے کھانا
اور مشکل ہو اسے بھگانا

5- ہرا ہرا یا پیلا پیلا
کچھ کچھ سوکھا کچھ کچھ گیلا
نرم نرم اور ڈھیلا ڈھیلا
بن چاقو کے اس کو چھیلا

(عفان عمار کھتران، تونسہ شریف)

6- اس کی ماں بھی آگ ہے
اس کا باپ بھی آگ ہے
دونوں کا وہ ایک ہی. بیٹا
ہوا میں تیرے کالا کلوٹا

7- بن بلائے ڈاکٹر آئے
پوچھے بنا ٹیکا لگائے

(حذیفہ اظہر، فیصل آباد)

جوابات: 1-امریکہ 2-انار 3-چینی 4-مکھی 5-کیلا 6-دھواں 7-مچھر

رنگ بھریئے۔

درج ذیل دیئے گئے جوابات میں سے درست جواب کا انتخاب کریں۔

1۔ حضرت صالحؑ سے کس جانور کا معجزہ منسوب ہے؟

i۔ گھوڑے کا　ii۔ اونٹنی کا　iii۔ ہاتھی کا

2۔ اسرائیل کس پیغمبر کا لقب ہے؟

i۔ حضرت موسیٰؑ　ii۔ حضرت عیسیٰؑ　iii۔ حضرت یعقوبؑ

3۔ سلطان صلاح الدین ایوبیؒ ایک نام ور مسلمان جرنیل تھے ان کا اصل نام بتایئے؟

i۔ حسن　ii۔ یوسف　iii۔ خالد

4۔ بادِ پیما ایک آلہ ہے۔ یہ کس نے ایجاد کیا؟

i۔ فارن ہائیٹ　ii۔ ماری لائی　iii۔ اینڈ وسن

5۔ بحیرہ روم اور بحیرہ احمر کے درمیان کون سی نہر واقع ہے؟

i۔ نہر پانامہ　ii۔ نہر سویز　iii۔ نہر ہوسٹس

6۔ قائداعظمؒ سے گورنر جنرل کا حلف کس نے لیا تھا؟

i۔ سید امیر علی　ii۔ میاں عبدالرشید　iii۔ سر شفیع محمد

7۔ گھوڑا گلی کالج کب قائم ہوا؟

i۔1858ء　ii۔1859ء　iii۔1860ء

8۔ ٹیبل ٹینس کی ابتداء کس ملک سے ہوئی؟

i۔ جاپان　ii۔ برطانیہ　iii۔ امریکہ

9۔ لیاقت علی خاں نے ایم اے کی ڈگری کب حاصل کی؟

i۔1921ء　ii۔1922ء　iii۔1923ء

10۔ علامہ اقبالؒ کا شعر مکمل کیجیے۔

یہی مقصودِ فطرت ہے، یہی رمزِ مسلمانی ....

جوابات علمی آزمائش ستمبر 2017ء

1- بغداد　2- چراغ حسن حسرت　3- 6 میل　4-120/80
5- گرین لینڈ　6- جابر بن حیان　7- کوہِ ارارات　8-1923ء
9- ٹھٹھہ　10- حریمِ کبریا سے آشنا کر

اِس ماہ بے شمار ساتھیوں کے درست حل موصول ہوئے۔ ان میں سے 3 ساتھیوں کو بذریعہ قرعہ اندازی انعامات دیئے جا رہے ہیں۔

☆ فوزیہ کوثر قادری، کاموکی　(150 روپے کی کتب)
☆ محمد عاصم شہزاد، میاں والی　(100 روپے کی کتب)
☆ اریبہ ماجد، میر پور آزاد کشمیر　(90 روپے کی کتب)

دماغ لڑاؤ سلسلے میں حصہ لینے والے کچھ بچوں کے نام بہ ذریعہ قرعہ اندازی:
حسن رضا سردار وصفی، حلیمہ نشان، خدیجہ نشان، نفیسہ فاطمہ قادری، عائشہ فاطمہ قادری، علی رضا قادری، محمد صفدان رضا قادری، نور حسین قادری، صدام حسین قادری، محمد نعمان قادری، محمد فہد قادری، محمد فریاد علی قادری، علی حمزہ رجب قادری، کاموکی۔ علشبہ شفیق، صفدہ رانی، عمارہ شفیق، اقراء مطلوب قریشی، سلمیٰ لیاقت، اقراء لیاقت، میر پور آزاد کشمیر۔ ملک محمد احسن، راول پنڈی۔ فاخر زمان، کرک۔ مطیع الرحمٰن، لاہور۔ رفیق احمد ناز، ڈیرہ غازی خان۔ شیخ رافع احسان حمدی، ملتان۔ سارہ جاوید، طلحہ قطب، مقصود اختر، لاہور۔ محمد دانش، ٹنڈو جام۔ محمد حسان عبداللہ، تلہ گنگ۔ حذیفہ، حیدر آباد۔ سندس آسیہ، کراچی۔ سارہ ارشد، سرگودھا۔ ردا فاطمہ فریال، راول پنڈی۔ محمد ابراہیم، اسلام آباد، واہ کینٹ۔ محمد شاہ میر لودھی، فیصل آباد۔ علینا اختر، کراچی۔ حارث نعیم، لاہور۔ فاطمہ احمد، راول پنڈی۔ محمد عمر اشرف آرائیں، کبیر والا۔ محمد احمد خان غوری، جویریہ غوری، بہاول پور۔ عائشہ شہزاد، لاہور۔ محمد احمد، ملتان۔ صائمہ کاردار، کوئٹہ۔ سفینہ شہزاد، کوٹ ادو۔ سلمان ظہیر، کراچی۔ کظیمہ زہرہ، احور کامران، لاہور۔ کامران اصغر، عامرہ کبیر، گجرات۔ محمد شہزاد، حیدر آباد۔ طارق احمد، بھیرہ۔ سونیا، کراچی۔ ربیعہ، لاہور۔ شکیلہ منیر، آزاد کشمیر۔ ملدم اکبر، جھنگ۔ نادرہ زیدی، رخسانہ زیدی، لاہور۔ توقیر احمد، افنان احمد، عدنان احمد، سلمان احمد، گوجرانوالہ۔ تنویر حسین، ٹوبہ ٹیک سنگھ۔ جاوید نذیر، حاصل پور۔ طیبہ ناز، راول پنڈی۔ آصفہ اصغر، عاصمہ اصغر، راول پنڈی۔ عائزہ ملک، شہزاد اطہر، شیخوپورہ۔ عتیق شہزاد، ظہیر منیر، لاہور۔ رفیق ملک، اطہر حق، آمنہ اشرف، آسیہ ارشد، ڈیرہ غازی خان۔

مدیرہ تعلیم و تربیت، السلام علیکم! کیسے ہیں آپ؟

ستمبر کا شمارہ زبردست تھا۔ تمام کہانیاں زبردست تھیں مگر ساتھ ہی رسالہ کچھ پھیکا پھیکا بھی محسوس ہو رہا تھا کیوں کہ پورے رسالہ میں کہیں بھی میرا خط شامل نہیں تھا۔ ویسے ایک بات بتایئے میرا ہی خط کیوں ہر بار ٹوکری صاحبہ کا نوالا بن جاتا ہے؟ اچھا اب شکوے شکایت نہیں کرتی اور میرے اس عاجز سے خط کو اپنے رسالے کی زینت ضرور بنایئے گا۔ اس بار کھوج لگایئے کا جواب اور کچھ لطائف بھیج رہی ہوں۔ پلیز! میرا یہ خط ضرور شائع کیجیے ورنہ رسالہ پھر پھیکا پھیکا محسوس ہوگا۔ اب اجازت چاہتی ہوں۔ اللہ حافظ!

(فضہ گل، نوشہرہ)

☆ تو فضہ ڈیئر! جواب حاضر ہے۔

آپ کا رسالہ ہر مرتبہ سپرہٹ ہوتا ہے۔ یہ رسالہ میرے امی ابو اور بھائی بہت دل چسپی سے پڑھتے ہیں۔ ارے ارے میں ردی بی بی کو سلام کرنا تو بھول گیا جو میرے تین چار خط ہڑپ کر گئی ہے۔ ردی بی بی السلام علیکم کیسی ہیں آپ؟ آپ سے گزارش ہے کہ تھوڑا کھایا کریں ورنہ پیٹ پھٹ جائے گا۔ ہاں تو بات ہو رہی تھی کہ ستمبر کا رسالہ بنکر نمبر 45، آپ بھی لکھیے، انسان تو یہ تھا، یہ کہانیاں بہت اچھی تھیں اور آپ سے گزارش ہے کہ اس خط میں جو بھی غلطی ہے وہ معاف کر دیں۔ پلیز اس بار میرا خط ضرور شائع کر دیں۔ اللہ تعالیٰ تعلیم و تربیت کو ترقی اور عزت دے۔ آمین!

پھول ہے گلاب کا خوش بو تو لیا کرو
یہ خط ہے غریب کا شائع تو کیا کرو

(عفان عمار، وہوا)

☆ پسندیدگی اور دعاؤں کا شکریہ!

کیسی ہیں آپ امید ہے کہ خیریت سے ہوں گی اور اگلے شمارے کی تیاری میں مصروف ہوں گی۔ ہم اس رسالے کے تین سال سے قاری ہیں۔ لیکن پہلی بار ہمت کر کے یہ قلم اٹھائی ہے اور امید ہے کہ یہ اٹھی ہوئی قلم کبھی گرے گی نہیں اور ہم سب کو یقین ہے کہ ہمارا خط ضرور شائع ہوگا۔ آپ ہماری امید نہ توڑیئے گا۔ اس بار کا رسالہ سوپر ڈوپر ہٹ تھا۔ ہم بہت سی چیزیں بھیج رہے ہیں اور ان شاء اللہ ضرور شائع ہوں گی اگر معیاری ہوئیں تو ضرور شائع کیجیے گا۔ رسالے میں سے بنکر نمبر 45، چٹو اور کالو، کبھی نہ بھولوں گی وغیرہ بہت اچھی تھیں۔ ویسے تو اس رسالے کو پہلے سے ہی چار چاند لگے ہوئے ہیں لیکن ہمیں لگتا ہے کہ ہمارے آنے سے پانچواں چاند بھی لگ جائے گا۔ کیوں کہ ہم نے زندگی میں ایک بات سیکھی ہے کہ انسان اس وقت تک نہیں ہارتا جب تک وہ خود ہار نہ مان لے۔ اس لیے اگر ہماری تحاریر اس بار شائع نہ کی تو اگلی بار ہم پھر کوشش کریں گے۔ کہتے ہیں کہ کسی کی محنت رائیگاں نہیں جاتی۔ آپی آپ بہت پیاری ہیں اور ہم آخر میں اس بات کے ساتھ اجازت چاہتے ہیں کہ یہ خط آپ ردی کی ٹوکری کی نذر نہیں کریں گی اور ہاں ردی خالہ آپ ہمارے خط سے دور ہی رہیں تو اچھی بات ہے۔ اس امید کے ساتھ کہ ہمارا خط ضرور شائع ہوگا۔

(سلمیٰ لیاقت، صفدہ رانی، عمارہ شفیق، میر پور آزاد کشمیر)

☆ خط کا شکریہ! تحریروں کے لیے رابطہ رکھیں۔

کیسی ہیں ڈیئر آپی جان یقین ہے کہ آپ خیریت سے ہوں گی۔ اس امید کے ساتھ کہ آپ ہمارا خط ضرور شائع کریں گی۔ کسی کا دل دکھانا بری بات ہے۔ اس لیے آپی آپ ہمارا دل نہ دکھایئے گا اور ہمارا خط ضرور شائع کیجیے گا۔ آپی کہیں ایسا نہ ہو کہ ہمارا خط ردی کی ٹوکری سے ٹکرا کر اس میں گر جائے۔ آپ اس کا خیال رکھیے گا کیوں کہ ہمارا خط بہت نازک ہے۔ اگر گر گیا تو بھی نام بچا لیجیے گا لیکن امید ہے کہ خط ضرور شائع ہوگا اور اسی امید کے ساتھ ہم نے باکس (box) بھر کر تحریروں کا بھی بھیج دیا ہے۔ اگر آپ کے رسالے میں ہماری تحاریر کے لیے جگہ ہوئی تو ضرور شائع کیجیے گا۔ رسالہ تو سارا ہی اچھا تھا۔ اگر میں نے ایک چیز کا نام لیا تو باقی سب سے ناانصافی ہوگی۔ اگر ہم انصاف کے ساتھ کام لے رہے ہیں تو آپ بھی انصاف کے ساتھ ہمارا خط ضرور شائع کیجیے گا۔ آپی آخر میں اس دعا کے ساتھ اجازت چاہتے ہیں کہ اللہ تعلیم و تربیت

کو دن دگنی رات چوگنی ترقی عطا فرمائے۔ (آمین)
(علشبہ شفیق، اقرا مطلوب، اریبہ ماجد، میر پور آزاد کشمیر)

امید ہے کہ آپ خیریت سے ہوں گی اور ہمارے پیارے رسالے کو تتلیوں کی طرح خوب صورت بنانے میں مشغول ہوں گی۔ سرورق دیکھ کر ایسا محسوس ہوا جیسا کہ اندھیری رات میں چودھویں کا چاند چمک رہا ہو۔ ''مرجھایا ہوا اخلاق، بنکر نمبر 45 اور سویا ہوا جذبہ پڑھ کر ہمارا جذبہ بھی تیندوے کی طرح چھلانگ لگا کر اٹھ بیٹھا۔ اگست کے شمارے میں اپنا خط شائع نہ دیکھ کر دل ٹوٹ گیا لیکن پھر خاموشی سے جوڑ لیا کہ اگلے شمارے میں ہمارا خط ضرور شائع ہوگا۔ آخر میں اجازت چاہتا ہوں ایک شعر کے ساتھ۔

دل ٹوٹا تو پھر سے جوڑ لیں گے ہم
تعلیم و تربیت سے رشتہ نہ توڑیں گے ہم

(محمد الیاس بھٹی، وہوا)

☆ اس پیارے سے خط کے لیے بہت شکریہ!

آپ نے ہمارا خط شائع نہ کیا لیکن ہم نے آپ سے منہ نہیں موڑا۔ آپ نے ہمارے دل کو توڑا۔ خیر چھوڑیئے...... خط شائع کرنا تو دور کی بات آپ نے تعلیم و تربیت کے کسی شمارے میں نام بھی شائع نہیں کیا لیکن ہم نے اپنی ہمت آپ باندھی اور دوبارہ سے خط لکھ دیا مگر...... ہمیں یہ بھی معلوم ہے کہ یہ خط شائع نہ ہوگا لیکن دل نے حوصلہ دیا کہ یہ خط ضائع نہ ہو گا لیکن...... اب پچھلے دو ماہ سے ہماری ردی آپا سے تو اچھی خاصی سلام دعا ہوگئی ہے تبھی تو ردی آپا ہمارے بغیر رہ نہیں پاتی اور ہر بار بلا لیتی ہیں۔ سیاست دانوں کی طرح تنقید تو خوب کر لی مگر تعلیم و تربیت کی تعریف ضرور کروں گی۔ میری تحریر اور خط کے علاوہ رسالہ پھیکا اور بدمزہ تو تھا لیکن اچھا بھی تھا لیکن اگر آپ میرا خط اور میری کہانی شائع کر دیتی تو سونے پہ سہاگا ہوتا۔ آخر میں ایک التجا ہے کہ میرے ننھے منے، چھوٹے موٹے، لمبے، چوڑے اور پیارے سے خط کو اکتوبر کے شمارے میں ضرور جگہ دیجئے گا۔ آخر میں خاص ایڈیٹر آپی کے لیے۔

آپ نے ہمارا خط شائع نہ کیا، اسے ہم آپ کی زندہ دلی سمجھیں یا احساس ہمدردی۔
(زویا رفاقت، چھلہ، ضلع بھمبر)

☆ آپ کا خط شائع کر دیا ہے۔ کیا خیال ہے اب؟

ستمبر کا شمارہ سپرہٹ تھا بس تمام خطوط میں اپنا خط نہ پا کر اداسی ہوئی۔ چلیں آپ نے نام تو شائع کیا لیکن خط شائع کروانے کا جنون ہمیں دوبارہ خط لکھنے پر مجبور کر بیٹھا۔ مگر شاباشی ہے ردی کی ٹوکری پر جو ہر بار بڑے مزے سے ہمارا خط ہضم کر لیتی ہے۔ شکایت کچھ زیادہ ہی ہوگئی اب آتے ہیں شمارے کی طرف۔ تمام کہانیاں ٹاپ پر تھیں ناول اچھا جا رہا ہے۔ ''میری بیاض سے'' سلسلہ بہت اچھا ہے اسے جاری رکھیے گا۔ آخر میں ایک درخواست ہے ردی کی ٹوکری سے وہ ہمارا خط ہضم نہ کرے اور اسے شائع ہونے دے۔

کس میں ہمت ہے کہ ہماری پرواز میں خلل ڈالے
ہم پروں سے نہیں حوصلوں سے اڑتے ہیں

(حفصہ فرقان، لاہور)

☆ ردی کی ٹوکری کو ہم نے ضائع کر دیا ہے۔ کیسا......؟

سلام! ان کو جو میرا یہ خط پڑھ کر ردی کی ٹوکری کی نذر کر دیتے ہیں۔ نہیں! ایسی کوئی بات نہیں ہے میں تو بس ایسے ہی بول رہی تھی رسالے کا سرورق بہت خوب صورت تھا اور کہانیاں لاجواب تھیں مجھے تو پڑھ کر مزا آیا۔ پتا نہیں باقی قارئین کے کیا خیالات ہیں۔ ہونہار مصور بہت پسند آیا اور ہاں بلاعنوان کے ساتھ ساتھ ''میری بیاض سے'' بھی زبردست تھا۔ آپی! میں بہت سی تحریریں بھیج رہی ہوں معیاری ہوئی تو ضرور ضرور شائع کیجئے گا میں بہت محنت سے لکھتی ہوں نہ صرف میں بلکہ باقی بچے بھی محنت سے لکھتے ہیں تو ہماری ساتھ ساتھ رہنمائی بھی کیا کریں تاکہ اچھی سے اچھی اور بہتر سے بہتر تحریر لکھیں۔ اوہو! اصل بات تو بھول ہی گئی پوچھیے کیا؟ ارے میں بھی ناں۔ آپ کیسے بتائیں گی چلیں میں خود ہی بتا دیتی ہوں۔ ''بنکر نمبر 45'' تو آہا بڑے مزے کی تھی میں نے کھا کر تو نہیں دیکھی مگر ہاں مزے کی تھی۔ باقی کہانیاں بھی اچھی تھیں۔ چلیں اب اجازت چاہتی ہوں۔ بہت دیر ہوگئی ہے۔ (میمونہ نوید، راول پنڈی)

جگہ کی کمی کے باعث صرف نام شائع کیے جا رہے ہیں:

محمد شماس حسین، بہاول پور۔ محمد ابراہیم، واہ کینٹ۔ فضہ گل، نوشہرہ۔ سارہ وحید، بھمبر، آزاد کشمیر۔ زیب النساء، راہوالی کینٹ۔ محمد ہمایوں انوار، جھنگ صدر۔ محمد رمیز بٹ، لاہور۔ محمد سہیل آزاد، لاہور۔ اقراء لیاقت، لاہور۔ طیبہ وحید، منڈی بہاؤ الدین۔ میمونہ رحمت، شرق پور شریف۔ عبدالرحمٰن طاہر، سیال کوٹ۔ سمیرا زاہد، فاضل۔ آمنہ یوسف، لاہور۔ حسن رضا سردار وصفی، حلیمہ نشان، خدیجہ نشان، کاموکی۔ سائرہ حبیب، تاندلیانوالہ۔ مومنہ عامر حجازی، لاہور۔ ثمرہ احمد سعید، ڈسکہ۔ خدیجہ تحریم، رینالہ خورد۔ مہرین احمد، آزاد کشمیر۔ محمد خلیل چودھری، جہلم۔ آشر، کراچی۔ کظیمہ زہرہ، احوز کامران، محمد احمد سرفراز، لاہور۔ عبدالمنیب آصف، میرب آصف، فیصل آباد۔ ماروشہ، منتہا، عبدالمقیت، لاہور۔

پیارے بچو! ہاتھی انسان دوست جانور ہے۔ اس میں بہت سی خوبیاں پائی جاتی ہیں۔ وہ مل جل کر رہتے ہیں۔ ایک دوسرے کے کام آتے ہیں۔ اگر ایک ہاتھی کسی مشکل میں پھنس جائے تو تمام ہاتھی اس مصیبت سے نکلنے میں اس کی مدد کرتے ہیں۔ ہمیں ان کی اچھی عادتوں سے سبق سیکھنا چاہیے۔

☆ ہاتھی دنیا میں خشکی کا سب سے بڑا جانور ہے۔ دنیا میں ہاتھیوں کی صرف دو اقسام ہیں: ایک ایشیائی ہاتھی اور دوسرے افریقی ہاتھی۔ یہ ہاتھی زیادہ تر جنگلوں میں رہتے ہیں۔ کچھ ہاتھی چراگاہوں اور سرسبز و شاداب سوانا گھاس کے میدانوں میں رہنا پسند کرتے ہیں۔ انہیں سوانا ہاتھی کہتے ہیں۔

☆ افریقی ہاتھی زیادہ تر گھنے جنگلوں میں پائے جاتے ہیں۔ ان کی اونچائی تیرہ فٹ (4 میٹر) تک ہوتی ہے۔ ان کی لمبائی تقریباً دو آدمیوں کے برابر ہوتی ہے۔ ان کے کان بڑے ہوتے ہیں۔ ان کے پچھلے پاؤں کی تین انگلیاں ہوتی ہیں اور سونڈ کے آخری حصے میں دو انگلیاں ہوتی ہیں۔ ان کا وزن بارہ ٹن تک ہوتا ہے۔

☆ ایشیائی ہاتھی جسامت میں افریقی ہاتھی سے قدرے چھوٹے ہوتے ہیں۔ ان کی اونچائی دس فٹ (3.2 میٹر) تک ہوتی ہے ان کی پیشانی گنبد نما ہوتی ہے جب کہ ان کی پشت قدرے ڈھلوان ہوتی ہے۔ ان کے کان بھی چھوٹے ہوتے ہیں۔ ان کے پچھلے پاؤں چار انگلیاں ہوتی ہیں اور سونڈ کے آخری حصے میں ایک انگلی سی ہوتی ہے۔

☆ پتھر کے زمانے کی جو تصویریں شمالی افریقہ سے دریافت ہوئی ہیں۔ ان سے معلوم ہوتا ہے کہ ہاتھی ایک زمانے میں صحرائے اعظم کے علاقے میں بھی رہے ہیں۔ یہ اس زمانے کی بات ہے۔ جب یہ علاقہ ابھی صحرا میں تبدیل نہیں ہوا تھا۔

☆ قرآن پاک میں بھی ہاتھی کا ذکر ہے۔ ترجمہ سورۂ فیل: ''کیا تم نے نہیں دیکھا۔ کہ تمہارے رب نے ہاتھی والوں کے ساتھ کیا کیا؟ کیا ان کی تدبیر کو اکارت نہیں کر دیا۔ اور ان پر پرندوں کے جھنڈ کے جھنڈ بھیج دیئے جو ان پر پکی ہوئی مٹی کے پتھر پھینک رہے تھے۔ پھر ان کا یہ حال کر دیا جیسے جانوروں کا کھایا ہوا بھوسا۔

☆ براعظم ایشیا میں ہاتھیوں کو کام کرنا بھی سکھایا جاتا ہے۔ لوگ ان پر سواری بھی کرتے ہیں۔ اور ان سے باربرداری کا کام بھی لیتے ہیں۔ ایک سوار ہاتھی کے سر کے پیچھے بیٹھا ہوتا ہے۔ ہاتھی اس کی ہدایات کے مطابق حرکت کرتا ہے۔ یہ

ہاتھی تقریباً سات ٹن تک وزن اٹھا سکتا ہے۔ یاد رہے کہ یہ وزن نوے آدمیوں کے برابر ہوتا ہے۔

☆ جنگوں میں ہاتھی کا استعمال زمانہ قدیم سے ہوتا آیا ہے۔ قرآن مجید کی ایک سورۃ ''الفیل'' اسی موضوع پر ہے۔ یمن کے بادشاہ ابرہہ نے خانہ کعبہ پر حملے میں ہاتھی استعمال کیے تھے۔

☆ 634ء میں معرکہ جسر میں حضرت مثنیٰ بن حارثہؓ کے مقابل ایرانی لشکر میں ہاتھی بھی شامل تھے۔

☆ جنگ قادسیہ میں حضرت سعد بن ابی وقاصؓ اسلامی لشکر کے سپہ سالار تھے ان کے مقابل ایرانی فوج میں 80 ہاتھی شامل تھے۔

☆ یونانی فاتح سکندر کے مقابلے میں دارا اور پورس کی افواج میں بھی ہاتھی شامل تھے۔

☆ ہاتھی غول کی شکل میں رہتے ہیں۔ ان میں مادہ، نر اور بچے بھی شامل ہوتے ہیں۔ ایک غول میں ان کی تعداد کم سے کم چار اور زیادہ سے زیادہ 100 تک ہو سکتی ہے۔ سب سے زیادہ ذہین اور تجربہ کار ہاتھی غول کی رہ نمائی کرتا ہے۔

☆ ہاتھی تیراکی بھی کر سکتے ہیں۔ کچھ ایشیائی ہاتھی دس کلو میٹر دور تک تیراکی کرتے دیکھے گئے ہیں۔

☆ ہاتھی کی ایک دن کی خوراک تقریباً ایک سو پچاس کلو گرام (330 پونڈ) ہوتی ہے۔ ہاتھی دن کے چوبیس گھنٹوں میں سے اٹھارہ سے بیس گھنٹے تک کھانے میں صرف کرتے ہیں۔ جان لیجیے، ہاتھی کی خوراک میں گھاس، درختوں کی شاخیں چھال اور پھل وغیرہ شامل ہیں۔ ایک افریقی ہاتھی ایک دن میں اپنے وزن کے چھ فی صد کے برابر خوراک کھاتا ہے۔ اگر کسی ہاتھی کا وزن پانچ ہزار کلو گرام ہے تو وہ تقریباً تین سو کلو گرام کھانا کھاتا ہے۔ ہاتھی اپنی خوراک پیسنے کے لیے چار دانت استعمال کرتے ہیں۔ یہ دانت جب گھس جاتے ہیں تو ان کی جگہ دوسرے دانت آ جاتے ہیں پوری زندگی میں یہ دانت چوبیس مرتبہ آتے ہیں۔

☆ گینڈا اور دریائی گھوڑا ہاتھی کے بعد دنیا کے سب سے بڑے ممالیہ جانور ہیں۔ سفید افریقی گینڈے کا وزن چار سے سات ٹن تک ہوتا ہے۔

☆ ہاتھیوں کی زندگی کا زیادہ تر حصہ خوراک اور پانی کی تلاش میں گزرتا ہے۔ ایک بڑے ہاتھی کو روزانہ 15 سے 20 گیلن تک (70 سے 90 لٹر) پانی کی ضرورت ہوتی ہے۔

☆ بعض اوقات خوراک کی کمی کے باعث ہاتھی خود کو بیمار محسوس کرتے ہیں۔ ایسے عالم میں اللہ تعالیٰ ان کی رہ نمائی کرتا ہے۔ وہ ان کا رخ ان غاروں کی طرف موڑ دیتا ہے۔ جہاں نمکیات موجود ہوں۔ ہاتھی غذا کی کمی کو پورا کرنے کے لیے ان غاروں میں چلے جاتے ہیں اور وہاں کی دیواروں کو چاٹ کر یا کھود کر نمکیات حاصل کرتے ہیں۔

☆ ہاتھی عام طور پر انہی راستوں پر سفر کرتے ہیں جو ان کے سفر کے لیے خاص ہو چکے ہوتے ہیں۔ اس ذہین جانور کی یادداشت بھی غضب کی ہوتی ہے۔ ایک بار جس راستے سے گزرتے ہیں۔ سالوں بعد بھی انہیں وہ راستہ یاد رہتا ہے۔

☆ ایک ہاتھی کی سب سے دلچسپ چیز اس کی لمبی سونڈ ہوتی ہے۔ ہاتھی کی سونڈ اصل میں اس کی ناک ہی ہوتی ہے جو اوپر والے ہونٹ کے ساتھ جڑی ہوتی ہے۔ وہ اس سونڈ کے ذریعے سے سانس لیتا ہے۔ سونگھتا ہے۔ شاخوں کو کھینچ کر نیچے لاتا ہے۔ چیزوں کو اٹھاتا ہے اور پکڑتا ہے اور اس کی مدد سے پانی پیتا اور فوارے کی شکل میں پانی پھینکتا ہے۔ ہاتھی کی سونگھنے کی حس بھی بے مثال ہے۔ وہ میلوں دور پانی کی موجودگی کا پتا چلا لیتے ہیں۔ ہاتھی کی سونڈ اتنی طاقت ور ہوتی ہے کہ وہ اس کی مدد سے چھوٹے موٹے درختوں کو جڑ سے اکھاڑ لیتا ہے۔ حالانکہ سونڈ میں ایک بھی ہڈی نہیں ہوتی۔

☆ ہاتھی کے کان بہت بڑے پنکھ کی طرح ہوتے ہیں۔ ہاتھی کی نظر تو اتنی تیز نہیں ہوتی لیکن اس کے کان بہت تیز ہوتے ہیں۔ میلوں دور کی ایسی ہلکی آواز بھی سن لیتے ہیں جو آدمی نہیں سن پاتا۔ جب ہاتھی اپنے کان پیچھے کی طرف کر لیتا ہے تو عام طور پر اس کی دو وجوہات ہوتی ہیں ایک تو وہ اس سے اپنے آپ کو آرام اور سکون میں محسوس کرتا ہے۔ دوسرے اس کی وجہ کوئی خوف اور اندیشہ بھی ہو سکتا ہے۔

☆ ہاتھی طویل عرصے تک زندہ رہتا ہے۔ اس کی عمر اسی سال تک ہوتی ہے۔

☆☆☆

چترال کی پہچان

شندور میلہ

رانا محمد شاہد

چترال...... دنیا بھر میں اپنے قدرتی حسن، پرکشش مقامات اور مہمان نوازی کے باعث اپنی خاص پہچان رکھتا ہے۔ یہ سطح سمندر سے اوسطاً 4900 فٹ کی بلندی پر واقع ہے۔ چترال پاکستان کے بلند ترین مقامات میں سے ایک ہے۔ یہ 15 سے 25 ہزار فٹ اونچے پہاڑوں کا خطہ ہے۔ چترال کا پرانا نام ''چھتراڑ'' تھا۔ جو بعد میں بدلتے بدلتے چترال ہو گیا۔

ہر سال ہزاروں سیاح چترال کی سیاحت کرنے آتے ہیں۔

چترال کے خوب صورت سیاحتی مقامات میں گرم چشمہ، بونی، گولین، بریر، کلاش اور رمداک لشٹ وغیرہ شامل ہیں لیکن چترال کی وہ خاص بات جو اس کی بین الاقوامی پہچان ہے، وہ یہاں کا شندور میلہ ہے۔ ویسے تو مقامی طور پر بہت سے کھیل کھیلے جاتے ہیں لیکن یہاں کا سب سے مقبول کھیل پولو ہے۔ پولو کو قدیم کھیل بھی کہا جاتا ہے۔ تاریخ پر نظر ڈالیں تو معلوم ہوگا کہ اس کھیل کا آغاز تقریباً 25 صدیاں قبل ایران میں ہوا۔ اس وقت کے حکمرانوں کا پسندیدہ کھیل پولو تھا۔ اسی لیے اسے بادشاہوں کا کھیل بھی کہتے ہیں۔ سلاطین دہلی کے بادشاہ قطب الدین ایبک کا انتقال پولو کھیلتے ہوئے ہوا۔ فردوسی (ایرانی شاعر) نے اپنی تصنیف ''شاہ نامہ'' میں اس کھیل کا ذکر شعروں میں کیا ہے۔ برصغیر میں سب سے پہلے برطانوی تسلط کے بعد 1962ء میں یہ کھیل ظاہر ہوا۔ برطانوی فوجی مانی پور کے علاقے میں لگائی جانوروں کی نمائش سے گھوڑے لائے اور وقت کی آندھی میں گم اس قدیم کھیل کو پھر سے متعارف کرایا۔ 1061ء میں یہ کھیل انگلستان میں بھی کھیلا جانے لگا۔ 1976ء کے قریب یہ کھیل امریکہ میں متعارف ہوا۔ پولو اولمپک گیمز کا بھی حصہ بنا لیکن 1936ء کے بعد سے یہ روایت ختم کر دی گئی تھی۔

پولو کا میدان تقریباً 300 گز لمبا اور 160 گز چوڑا ہوتا ہے۔ گول پوسٹ کی چوڑائی 24 فٹ جب کہ اونچائی تقریباً 10 فٹ ہوتی ہے۔ ابتدا میں فری اسٹائل پولو کھیلی جاتی تھی۔ جس میں کوئی خاص قانون نہیں ہوتا تھا لیکن آہستہ آہستہ دیگر کھیلوں کے قوانین میں تبدیلی آئی تو پولو میں بھی ریفری سسٹم متعارف ہوا۔ گلگت بلتستان میں آج بھی فری اسٹائل پولو ہوتی ہے۔ فری اسٹائل پولو میں کوئی ریفری نہیں ہوتا۔ ہر ٹیم میں چار کھلاڑی ہوتے ہیں۔ میچ کا دورانیہ ایک گھنٹہ ہوتا ہے۔ ہر کھلاڑی صرف ایک گھوڑا استعمال کر سکتا ہے۔ کھیلنے کے لیے چھڑی بانس کی بنی ہوتی ہے۔ اور بید کی جڑ کی بنی ہوئی گیند کا استعمال کیا جاتا ہے۔ گیند کا وزن 5 اونس ہوتا ہے۔ اس کا قطر سوا 3 انچ ہوتا ہے۔ ان علاقوں میں

فری اسٹائل پولو کے سالانہ کئی مقابلے منعقد ہوتے ہیں لیکن یہاں کا سب سے بڑا میلہ شندور پولو میلہ ہی ہے۔

پولو کا کھیل چترال کے مقامی لوگوں کا قومی اور مقبول کھیل تصور کیا جاتا ہے۔ فری اسٹائل پولو کا سب سے بڑا میدان بھی یہیں دنیا کے سب سے اونچے پولو گراؤنڈ شندور میں ہی لگتا ہے۔ گلگت بلتستان اور چترال کی سرحد پر شندور پولو گراؤنڈ سطح سمندر سے تقریباً 12 ہزار فٹ کی بلندی پر واقع ہے۔ ہر سال جولائی کے مہینے میں دنیا کے اس مقبول ترین و بلند ترین پولو گراؤنڈ شندور میں چترال اور گلگت کی ٹیموں کے درمیان سنسنی خیز پولو میچ کا انعقاد کیا جاتا ہے۔ شندور پولو گراؤنڈ چترال سے تقریباً 147 کلو میٹر اور گلگت سے 211 کلو میٹر کے فاصلے پر واقع ہے۔

سال کے زیادہ تر عرصے میں یہ جگہ برف سے ڈھکی رہتی ہے۔ البتہ موسم گرما کے آتے ہی برف پگھلنا شروع ہو جاتی ہے اور آہستہ آہستہ یہ مقام سر سبز و شاداب علاقے میں بدل جاتا ہے۔ یہاں پر قدرتی جھیل (جسے شندور جھیل بھی کہتے ہیں) بھی دیکھنے کو ملتی ہے۔ وسیع رقبے پر پھیلی اس خوب صورت شندور جھیل کو دیکھنے کے لیے ملکی و غیر ملکی سیاحوں کی ایک بڑی تعداد شندور پولو گراؤنڈ کا رخ کرتی ہے اور قدرت کے اس خوب صورت نظارے سے لطف اٹھاتی ہے۔

شندور میلے کا سب پہلے انعقاد 1920ء میں ہوا۔ اس میلے کے انعقاد میں برطانوی فوج کے کرنل اور پولو کھلاڑی حئ کوب نے اہم کردار ادا کیا۔ تب سے اب تک ہر سال یہ میلہ منعقد ہوتا ہے۔ ہر سال یہ شندور میلہ 3 دن تک جاری رہتا ہے۔ اس میلے میں فری اسٹائل پولو، پیرا گلائیڈنگ، سیر و تفریح اور مختلف کھیلوں کا انعقاد ہوتا ہے۔ میلے میں شرکت کے لیے پاکستان سمیت دنیا بھر کے شائقین اس دور دراز علاقے کا رخ کرتے اور فری اسٹائل مقابلوں سے لطف اندوز ہوتے ہیں۔ شندور میلے میں سب سے بڑا میچ چترال اور گلگت کی ٹیموں کے درمیان ہوتا ہے۔ میلے میں موسیقی اور رقص کا اہتمام بھی کیا جاتا ہے۔ تاکہ پولو دیکھنے کے لیے آئے دنیا بھر کے سیاحوں کو ثقافتی قدروں سے لطف اٹھانے کا موقع بھی مل سکے۔

شندور پولو کے لیے استعمال ہونے والا دنیا کا یہ بلند ترین گراؤنڈ تقریباً 220 گز لمبا اور 60 گز چوڑا ہوتا ہے۔ اس کے اردگرد پتھروں کی دو فٹ اونچی دیوار تعمیر کی جاتی ہے۔ تاکہ گھوڑا گراؤنڈ سے باہر نہ جاسکے۔ بلندی کی وجہ سے جیسا کہ بتایا گیا ہے کہ سال کا زیادہ عرصہ شندور پاس بند رہتا ہے۔ اس عرصے میں یہ سفید چادر اوڑھ لیتا ہے۔ صرف میلے کے دنوں میں ہی یہاں گہما گہمی نظر آتی ہے۔ عام حالات میں شندور پولو گراؤنڈ سمیت وہاں کے زیادہ علاقے کو مقامی افراد چراگاہ کے طور پر استعمال کرتے ہیں۔

ملکی حالات اور روز بروز بڑھتی بدامنی کی وجہ سے ایسے میلے نہ صرف لوگوں کی سیر و تفریح کے لیے اہم ہیں بلکہ ملکی معیشت کی بہتری کے لیے بھی اہمیت رکھتے ہیں۔ حکومتی سطح پر اس میلے کی اہمیت کو اجاگر کر کے اور یہاں مزید ترقیاتی کام کروا کر دنیا بھر کے سیاحوں کی توجہ حاصل کی جاسکتی ہے۔ ☆☆☆

وادئ نیلم کی خوبصورت جھیلیں

اعجاز سرفراز

آزاد کشمیر قدرتی مناظر سے بھرپور خطہ ہے۔ اس کی پرفضاء وادیاں اپنی خوب صورتی بلندی عظمت کی داستانیں سناتی ہیں۔ جب ان وادیوں کی یاد نے ہمیں ستایا تو ہم سے رہا نہ گیا اور پھر اس کی طرف جانے کا ارادہ کیا لہٰذا ایک ہائیکنگ گروپ تشکیل دیا۔ میرے ہم سفر دوستوں میں تنویر خالد، میاں افضل، سید واسط، احسن آصف، اویس بابر، ہمارا گائیڈ دوران خان اور میں ناچیز محمد اعجاز سرفراز خاں۔

ہم نے اپنے سفر کا آغاز بروز جمعہ 14 جولائی 2017ء کو لاہور سے رات 8 بجے کیا۔ ایک گھنٹہ لاہور میں ٹریفک بلاک ہونے سے ضائع ہو گیا۔ مانسہرہ پہنچ کر ناشتا کیا پھر سفر شروع کر دیا۔ سات بج کر چالیس منٹ پر مظفر آباد پہنچ گئے۔ جاتے ہی مظفر آباد تا دواریاں کے لیے کوسٹر بک کروائی۔ 15 جولائی 2017ء کو 9 بجے مظفر آباد سے چلے۔ تین بجے دواریاں پہنچ گئے۔ وہاں جا کر جیپ بک کروائی۔ تمام جیپیں رتی گلی گئی ہوئی تھیں۔ بڑی مشکل ہوئی، جانا بھی تھا لیکن وقت بہت ضائع ہوا۔ عبدالمجید صاحب جیپ اڈے والوں کی مہربانی انہوں نے جلدی سے جیپ کروا دی۔ 4 بج کر 30 منٹ دواریاں سے چلے اور رتی گلی بیس کیمپ 6 بج کر 45 منٹ پر پہنچ گئے۔ راستے میں 12 گلیشئر آئے تھے جنہیں کاٹ کر سڑک نکالی تھی۔ ہم سیدھے بیس کیمپ پہنچ گئے۔ دو ہفتے پہلے ہمارے دوست قیوم صاحب 18 افراد کا ایک گروپ لے کر آئے تھے۔ اس وقت 12 گلیشئر تھے۔ وہ ان پر سفر کر کے بڑی مشکل سے رات ایک بجے بیس کیمپ آئے اور بیمار ہو گئے۔ اللہ تعالیٰ کا شکر ہے۔ اب راستہ بہت بہتر ہے، بس ٹھنڈ بہت زیادہ ہے۔ ہم نے کھانے کا آرڈر دیا۔ کیمپ میں سامان رکھا اور مغرب کی نماز ادا کی۔ یہاں بہت سے لوگ آئے ہوئے تھے۔ فیملیز کے ساتھ۔ تیز ہوا چل رہی تھی لائٹ کا انتظام نہیں تھا۔ ایمرجنسی لائٹ سے گزارا ہو گیا۔ اب رات ہو گئی۔ ہر طرف ستارے ہی ستارے نظر آ رہے تھے۔ اتنے ستارے لاہور میں نظر نہیں آتے۔ عشاء کی نماز پڑھ رہے تھے تو لگتا تھا ٹھنڈی ہوا بھی اللہ کی شان بیان کر رہی ہے۔ رات بہت ٹھنڈی گزری، شکر کہ بارش نہیں ہوئی۔ یہاں کے لوگ بہت اچھے ہیں۔ بہت تعاون کرنے والے ہیں۔ فیملیز کے لیے بہت اچھی جگہ ہے۔

16 جولائی 2017ء کو رتی گلی بیس کیمپ سے صبح 5 بج کر 30 منٹ پر چلے "پی شیپ لیک" پر 6 بج کر 15 منٹ میں پہنچ گئے۔ "پی شیپ لیک" شیشے کی طرح صاف ستھری تھی۔ اس کے

پیچھے بہت بڑی آبشار تھی۔ بہت ہی خوب صورت منظر تھا۔ یہاں سے پی شیپ لیک سے چلے اور 6 بج کر 50 منٹ پر رتی گلی جھیل پہنچ گئے۔ جھیل پھولوں سے سجی دلہن کی طرح لگ رہی تھی۔ اردگرد رنگ برنگے پھول ہی پھول تھے اور سامنے سفید گلیشئر بہت ہی پیارا منظر پیش کر رہا تھا بے اختیار ہی زبان سے سبحان اللہ نکل گیا۔ سامنے سے تیرتا ہوا گلیشئر کا ایک حصہ ہماری طرف آ رہا تھا اور بے شمار چھوٹے چھوٹے ٹکڑے کنارے کو بوسہ دے رہے تھے۔ بہت ہی دل فریب منظر تھا کچھ دیر یہاں رکے فوٹو گرافی کی مگر جو آنکھوں نے عکس بنایا تھا بیان سے باہر ہے۔ رتی گلی جھیل سے واپسی پر ہم 40 منٹ میں آ گئے راستہ بہت منفرد تھا۔ 9 بج کر 50 منٹ پر رتی گلی بیس کیمپ سے چلے 11 بج کر 50 منٹ پر دواریاں پہنچ گئے "ویلی ٹیکرز کیمپ ویلج" بیس کیمپ رکنے کے لیے اچھا ہے، لوگ اچھے ہیں۔ رتی گلی جھیل 12130 فٹ کی بلندی پر واقع ہے۔ 11 بج کر 55 منٹ دواریاں سے چلے 3 بجے کیل پہنچ گئے یہاں المدینہ ہوٹل ٹھہرے مینجر رانا شاہ جہان بہت اچھے انسان ہیں۔ یہاں رات گزاری۔ ہم پہلے بھی کئی بار یہاں رکے ہیں۔

17 جولائی 2017ء کو 6 بج کر 35 منٹ پر صبح کیل سے دومیل کے لیے روانہ ہوئے۔ پہلے تو اس راستہ پر جیپ میں 4 گھنٹے لگ جاتے تھے اب 8 بج کر 35 منٹ پر تقریباً 2 گھنٹے میں ہم دومیل بالا پہنچ گئے۔ ناشتا کیا گائیڈ دوران خان کو یہاں سے لیا "چٹہ کھٹہ لیک ویو پوائنٹ ویلج" (دومیل) سے 9 بج کر 50 منٹ پر نکلے۔ جاتے ہوئے مشکل مگر چھوٹے راستے کا انتخاب کیا؟ وہی راستے "سی کے" کو جاتے ہیں۔ ایک آبشار والا دوسرا گجروں والا راستہ جہاں سے گجر لوگ اپنی بکریوں اور گائیں کو لے جاتے ہیں یہ لمبا راستہ ہے۔ 12 بج کر 35 منٹ "پری کے" بیس کیمپ پہنچ گئے۔ وہاں انہی کیمپ کا ویو سائیڈ ہے۔ کیمپ لگوایا کھانے کا کہا کیوں کہ کھانا 2 یا 3 گھنٹے میں تیار ہوتا ہے۔ کھانے میں پانی گلیشئر کا استعمال ہوتا ہے۔ نماز کا وقت ہوا تو میں نے اذان دی۔ سب نے نماز ظہر ادا کی۔ بہت ہی خوب صورت منظر تھا، دھوپ میں نماز ادا کی۔ اذان کی آواز چاروں طرف گونج رہی تھی۔ بہت سردی تھی، کھانے کے انتظار میں دھوپ میں بیٹھے رہے، یہاں دھوپ بہت اچھی لگ رہی تھی، کھانا کھایا اور کل کے پروگرام کو فائنل کیا۔ اس جگہ کو وزٹ کیا۔ جہاں رہنے کو جگہ ہے مگر واش روم نہیں ہیں۔ کیوں کہ لینڈ سلائیڈنگ ایریا ہے کیمپ ہی مشکل سے لگتے ہیں۔ بارش بہت ہوتی ہے۔ جو بھی عمارت بنائی جاتی ہے بارش اور لینڈ سلائیڈنگ کی وجہ سے ختم ہو جاتی ہے۔

17 جولائی 2017ء کو صبح 5 بج کر 50 منٹ پر ڈاک ون کے لیے نکلے۔ ڈاک ون سے ڈاک ٹو ایک گھنٹہ میں پہنچے۔ ڈاک ٹو سے چٹہ کھٹہ لیک (CK) 2 گھنٹے میں پہنچے۔ ہمارے ساتھ بزرگ ٹورسٹ تنویر خالد صاحب بھی تھے جو تقریباً 70 سال کے

ہیں۔ ان کا بھی خیال کرتے ہوئے آہستہ چلنا تھا پھر بھی شکر ہے ٹھیک ٹھاک پہنچ گئے۔ ہمارے ہوتے ہوئے یہ ٹیمیں آئیں تھیں۔ CK کو سر کرنے ایک ٹیم کراچی سے ایک لڑکی کے ہمراہ آئی تھی جو ہیری پربت کے پاس سے واپس آ گئی ایک اور ٹیم کے 6 ارکان لاہور سے آئے تھے، ان کے 2 ارکان نے CK کو سر کیا باقی نہ کر سکے۔ دو زخمی ہو گئے۔ اللہ کا کرم ہے ہم ساتوں ارکان نے CK Lake کو سر کر لیا۔ جب CK پر پہلی نظر پڑی تو بے اختیار ہی "سبحان اللہ" نکل گیا۔ اس لمحہ جو اللہ کی قدرت کی تعریف دل سے نکلی شاید نماز میں بھی اتنی خالص تعریف نہ بیان کی جا سکی ہو کیوں کہ اس لمحہ میں صرف قدرت کے نظارے اور بندہ آمنے سامنے تھے۔ واپسی پر ہم CK سے ڈاک ون تین گھنٹے میں پہنچ گئے۔ CK Lake تقریباً 14000 فٹ کی بلندی پر واقع ہے۔

19 جولائی 2017ء بیس کیمپ ڈاک ون سے گجروں والے راستے سے اوپر دومیل گئے۔ 7 بج کر 20 منٹ پر سفر شروع کیا 10 بج کر 20 منٹ پر دومیل تھے، راستہ بہت خوب صورت تھا۔ کبھی بادل ہمارے اوپر آ جاتے کبھی برابر پر آ جاتے اور کبھی بہت نیچے چلے جاتے۔ صبح کا ناشتا ہم نے جنگلی سٹابری سے کیا، اس خوب صورت راستے پر چلنے میں بہت مزہ آ رہا تھا۔ سارا راستہ پھولوں سے سجا ہوا تھا۔ گویا بارات کا استقبال ہو رہا ہو۔ دومیل پہنچ کر دوبارہ ناشتا کیا۔ یہی راستہ سیدھا Shounter Lake کو چلا جاتا ہے۔ بیڈمنٹن کے ریکٹ کی شکل والی گہرے نیلے رنگ کی "Shounter Lake" بہت ہی خوب صورت ہے۔ اس وادی کی بلندی 13000 سے 15000 فٹ ہے۔ Shounter Lake کی بلندی 15000 فٹ ہے۔ پھر ہم دومیل سے کیل کے لیے روانہ ہوئے۔ دو گھنٹے میں کیل پہنچ گئے۔ المدینہ ہوٹل کیل میں رات بسر کی۔ گزارے کے لیے یہ ہوٹل ٹھیک ہے۔

20 جولائی 2017ء کو ہم کیل سے اوڑنگ کیل کے لیے روانہ ہوئے۔ اب تو چیئر لفٹ لگ گئی ہے۔ چند منٹوں میں دریا پار ہو جاتا ہے۔ چالیس منٹ ہائیکنگ کر کے اورنگ کیل وادی میں داخل ہو جاتے ہیں۔ بہت ہی لش گرین وادی ہے۔ وادی کے آخر میں گلیشئر اوپر سے نیچے آتے ہوئے بہت بھلے لگتے ہیں۔ وہاں ہم جب بھی جاتے ہیں "ڈریم ویلی گیسٹ ہاؤس" ہی ٹھہرتے ہیں کیوں کہ اس کے مالک محمد بشیر ہمارے پرانے دوست ہیں اور بہت پیار کرنے والے انسان ہیں۔ یہاں کے لوگ بہت محنتی ہیں۔ انہوں نے اپنے طور پر بہت سے فلاحی کام کیے ہیں۔ رات بہت ٹھنڈی تھی، بہت مزہ آیا۔ ہم اوڑنگ کیل کو نیلم کا مری کہتے ہیں۔ جب ہائیکنگ سے تھک جاتے ہیں تو آرام کی غرض سے یہاں آتے ہیں۔

21 جولائی 2017ء کو ناشتا کرنے کے بعد ہم نے اوڑنگ کیل سے کیل کی طرف سفر شروع کیا۔ آدھے گھنٹے میں لفٹ تک پہنچ گئے۔ جاتے ہوئے لفٹ سے اوپر 40 منٹ لگے تھے اوڑنگ کیل کے لیے۔

کیل پہنچ کر مظفر آباد کے لیے کوسٹر لی سفر شروع کر دیا۔ اب حسرت بھری نگاہوں سے نیلم کو دیکھ رہے تھے اس کی جنگلی آبشاریں ندی نالے دریا پرندے ہوائیں یاد آ رہی تھیں۔ 8 گھنٹے میں مظفر آباد پہنچ گئے۔

وہاں جا کر پہلے بکنگ کرائی پھر فریش ہو کر حضرت سائیں سہیلی سرکارؒ کے مزار پر چلے گئے، بہت ہی پیاری ہستی ہیں۔ وہاں عصر کی نماز ادا کی شام کا کھانا کھایا اور اڈے پر آ گئے۔ سری نگر کوچ کی ڈائیوو سروس سے لاہور آئے۔ 8 گھنٹے میں لاہور پہنچ گئے۔

لاہور پہنچنے پر سخت گرمی نے پرزور استقبال کیا۔ ٹھنڈے علاقے سے واپسی پر زیادہ ہی گرمی کا احساس ہوتا ہے۔ گھر پہنچ کر اللہ تعالیٰ کا شکر ادا کیا۔ جس نے اپنی قدرت کی خوب صورتی دکھائی۔ بہت سے پاکستانی دوسرے ممالک میں سیر کے لیے جاتے ہیں۔ جب کہ پاکستان دنیا کے خوب صورت ملکوں میں ایک منفرد ملک کی حیثیت رکھتا ہے۔ یہاں سب کچھ ہے۔ بس صرف اپنی اپنی جگہ پر ذمہ داری کا احساس ہونا چاہیے۔ واپس آ کر وادی کشمیر کی جدائی کا احساس ہونے لگا ایسا معلوم ہو رہا تھا کہ جسم تو لاہور میں آ گیا ہے مگر دل نیلم میں ہی رہ گیا ہے۔ ارادہ کیا ان شاء اللہ اگلے سال پھر ان وادیوں میں جائیں گے۔ اللہ تعالیٰ کی قدرت کے نظارے کرنے۔ آمین! ☆☆☆

بلاعنوان

اس تصویر کا اچھا سا عنوان تجویز کیجیے اور 500 روپے کی کتب لیجیے۔ عنوان بھیجنے کی آخری تاریخ 10/اکتوبر 2017ء ہے۔

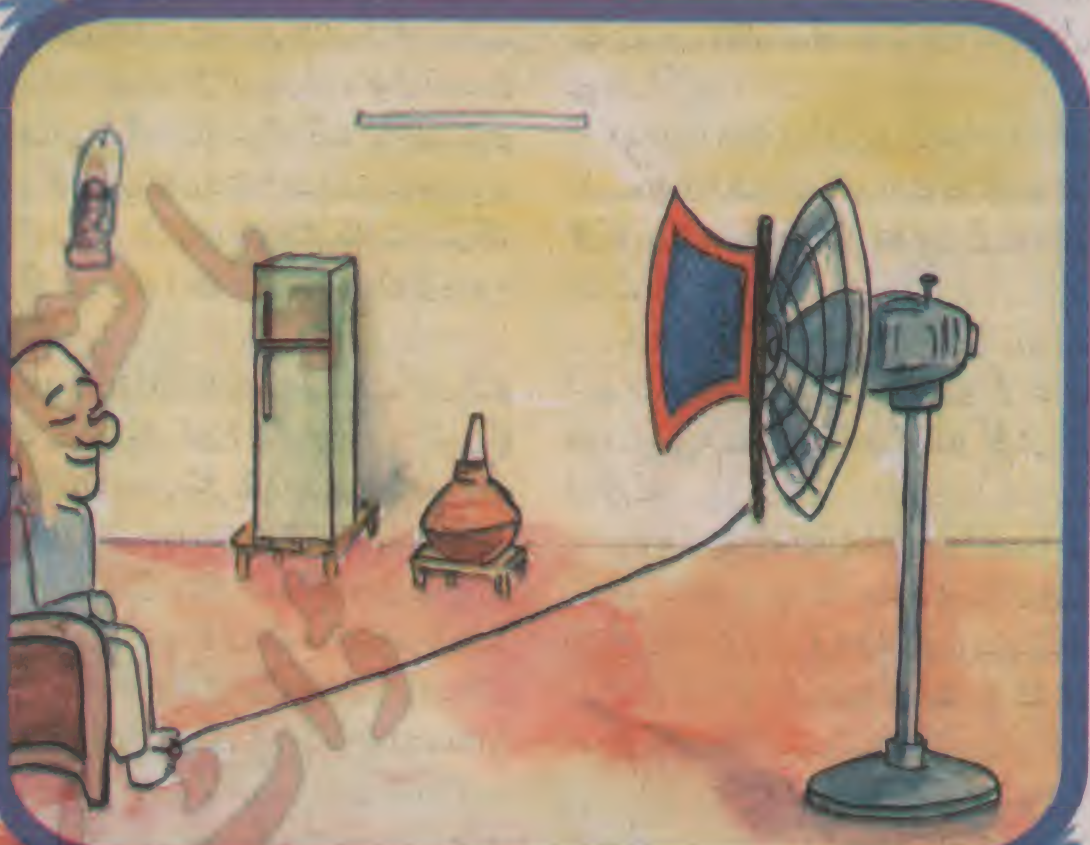

ستمبر 2017ء کے ''بلاعنوان کارٹون'' کے لیے جو عنوانات موصول ہوئے، اُن میں سے مجلسِ ادارت کو جو عنوانات پسند آئے، اُن عنوانات میں سے یہ ساتھی بہ ذریعہ قرعہ اندازی 500 روپے کی انعامی کتب کے حق دار قرار پائے۔

- نام مولا مجھ کو اس کشتی میں لے جانا ضرور، ورنہ میں تو اس جزیرے میں پڑا رہ جاؤں گا (ریاض حسین قمر)
- کانپتا ہے دل ترا، اندیشۂ طوفاں سے کیا، ناخدا تو، بحر تو، کشتی بھی تو، ساحل بھی تو (محمد شماس حسین، بہاول پور)
- آؤ، آگے آ کے ریس لگاؤ، پھر دیکھتے ہیں کس کی ہے کشتی، کس کی ہے ناؤ (صدف آسیہ، کراچی)
- طوفانوں سے ڈرنے والے اے سمندر نہیں ہیں ہم سو بار کر چکی ہے مدد یہ پیاری ڈولفن ہماری (علینا اختر، کراچی)
- ڈرتے نہیں اہلِ ہنر طوفان سے، کود آؤ جلدی مچھلی پر کشتی سے (محمد ابراہیم، اسلام آباد، واہ کینٹ)

ہونہار مصور

یومِ دفاع

تصاویر صرف افقی رخ میں ہی بنائیں۔

سیدہ تحریم مختار، لاہور (پہلا انعام: 195 روپے کی کتب)

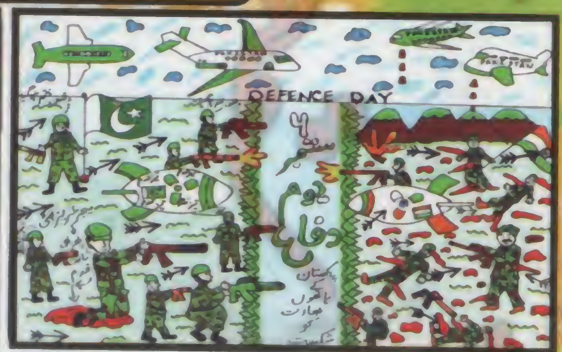

زہرا شاہد، سرگودھا (دوسرا انعام: 175 روپے کی کتب)

احسن بلال، لاہور (تیسرا انعام: 125 روپے کی کتب)

میمونہ نوید، راول پنڈی (چوتھا انعام: 115 روپے کی کتب)

مریم منیب، لاہور (پانچواں انعام: 95 روپے کی کتب)

کچھ اچھے مصوروں کے نام بہ ذریعہ قرعہ اندازی: مومنہ عامر حجازی، لاہور۔ اقراء لیاقت، لاہور کینٹ۔ سارہ وحید، آزاد کشمیر۔ دائنہ زرار، لاہور۔ عمیرہ شاہد، راول پنڈی۔ حسن منیب، لاہور۔ مومنہ نور۔ فرواہ خالق۔ لیہ۔ ماہ نور پیرزادہ، ملتان۔ مقصود اختر، لاہور۔ قریشہ فاطمہ فاروقی، رحیم یار خان۔ صاحبزادہ محمد حسنین ہاشمی، اٹک۔ سمعیہ توقیر، کراچی۔ رافعہ یاسین، سوہاوہ۔ بشریٰ حسینی، کلور کوٹ۔ حماس صارم، لاہور۔ آمنہ عرفان، راول پنڈی۔ حیدر علی، لاہور۔ عمیرہ طور، کراچی۔ فرید احمد، لاہور۔ سادیہ نعمان، لاہور۔ حمیرہ خاتون، کلور کوٹ۔ فروا جمیل، لاہور۔ ارمش مبشر، لاہور۔ ماہا چوہدری، سیال کوٹ۔ فائزہ رزاق، خانیوال۔ آمنہ عاصم، راہوالی۔ نوشین مسعود، ملتان۔ راجا محمد اسلم، راول پنڈی۔ افتخار بھٹی، جہلم۔ محمد یاسین قمر، خانیوال۔ عفت بتول، لاہور کینٹ۔ احسن فاروق، راول پنڈی۔ ام کلثوم، خانیوال۔ ریاض حسین، واہ کینٹ۔ عامر سہیل، لاہور۔ عمیرہ بشیر، قصور۔ عمران فاروق، اوکاڑہ۔ عیان جنید، حیدر آباد۔ عروسہ خالد، اٹک۔ محمد سلیمان بٹ، ساہی وال۔ عثمان حیدر، پشاور۔

اکتوبر کا موضوع
بڈ شاپ
آخری تاریخ 8 اکتوبر

نومبر کا موضوع
موسمِ خزاں
آخری تاریخ 8 نومبر

ہدایات: تصویر 6 انچ چوڑی، 9 انچ لمبی اور رنگین ہو۔ تصویر کی پشت پر مصور اپنا نام، عمر، کلاس اور پورا پتا لکھے اور اسکول کے پرنسپل یا ہیڈ مسٹریس سے تصدیق کروائے کہ تصویر اسی نے بنائی ہے۔